إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

مئی ۲۰۲۲ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

تدریس القرآن پراجیکٹ

الحمد للہ

الذی بنعمته تتم الصالحات

تدریس القرآن پراجیکٹ کے زیر اہتمام لاہور اور پنجاب کے سکولوں میں ادارے کے تیار کردہ پاروں اور ٹیچر گائیڈز کی ترویج جاری ہے۔ مارچ کے آخر تک کے اعداد وشمار:

سکول جن میں تدریس القرآن پڑھایا جارہا ہے	۷٦۰
طلبہ وطالبات جو ان سکولوں میں ترجمہ قرآن سیکھ رہے ہیں	۷۰,۰۰۰
ماسٹر ٹرینرز اور اساتذہ جن کو اس مقصد سے ٹریننگ دی گئی	۳٦۰۰
کل تعداد طباعت پارہ ①، پارہ ③، پارہ ⑥	۱,۲۰,۰۰۰

دعا اور تشجیع کی درخواست کے ساتھ

چیئرمین (اعزازی): محمد منشا طور   سی ای او (اعزازی): پروفیسر ڈاکٹر محمد امین
سی او او (اعزازی): پروفیسر ایم اے رفرف

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: 0322-8614998 0300-410728 ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل

اسلامی سکول کے خدوخال

تعلیم اور اس کا اسلامی کردار

یکساں قومی نصاب۔ خدشات ومضمرات

تدریس القرآن ① برائے معلمین

تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات

پنج سورہ (اُردو تفہیم)

اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی

تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظام تعلیم

نصابِ مدنیؒ

مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ وتجزیہ

اصلاحِ دینی مدارس

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟

ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت

خاموش انقلاب۔ ناگزیر ہے

عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)

حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)

اپنی اصلاح آپ کیسے؟

ترکِ رذائل (احمد جاوید)

اسلام اور تعمیر سیرت (زیرِ طبع)

مغربی فکر وتہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش

اسلام اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ

اسلام اور ردِ مغرب

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل

مقالاتِ امین (جلد اوّل)

مقالاتِ امین (جلد دوم)

شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۶، شمارہ ۵، مئی ۲۰۲۲ء/شوال ۱۴۴۳ھ

مشمولات

○فکر و نظر

جاگتے رہو! مدیر ۴

○تعلیم و تربیت

- یونیورسٹیوں میں بے دینی کے ماحول کا فروغ ادارہ ۵
- یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر فراڈ ڈاکٹر شہزاد اقبال شام ۸
- عورت اور تعلیم سید خالد جامعی ۱۱
- تعلیم کے سوداگروں کی کارستانیاں پروفیسر عاصم حفیظ ۱۴
- مدرسہ ڈسکورسز پروگرام، اب بھارت میں یاسر ندیم واجدی ۱۶
- جدید اسلامی تحریک: تعلیم وتزکیہ کی اہمیت؟ مدیر ۱۹

○فہم دین

- رمضان المبارک سے صحیح استفادے کے موانع سید خالد جامعی ۲۰
- یوکرین تنازعہ اور اسلامی تحریکیں ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۲۲

○اسلام اور تجدد

- احمد جاوید صاحب اور مدحتِ غامدی مدیر ۲۹
- احمد جاوید صاحب اور غامدی صاحب کی حمایت ڈاکٹر مشتاق احمد ۳۱
- جاویدین جاودان ڈاکٹر عزیز ابن الحسن ۳۴
- غامدی صاحب کی حمایت کا نرالا انداز پروفیسر رحیم بخش ۳۸
- غامدی صاحب: علمیت اور حسنِ اخلاق؟ سید خالد جامعی ۴۰
- مسلم معاشرے میں تجدد ڈاکٹر محمد امین ۴۲

○اسلام اور پاکستان

- اسلام آباد ہائیکورٹ کا خلافِ شریعت فیصلہ مدیر ۴۸
- پاکستان کا سیاسی بحران ۔ دروس وعبر ۶۱
- یوتھ کلب پاکستان: ایک تعارف پروفیسر عاصم حفیظ ۶۹

○عالم اسلام/افغانستان

- اسلامی افغانستان ڈاکٹر محمد امین ۷۴
- افغانستان میں یورپی زرعی منصوبے کا نفاذ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۷۶

○خود نوشت

میں نے زندگی سے کیا سیکھا؟ (۸) مدیر ۸۱

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن

(0309-4607124)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 70 روپے

سالانہ 800 روپے۔ پانچ سال: 4000 روپے

تاحیات 15,000 روپے

تحریکِ اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف

0306-4640366

فکرونظر

جاگتے رہو!

پاکستان کا سیاسی بحران

عمران خان کی ناکامی کے دو حقیقی سبب تھے: مہنگائی اور کرپشن کنٹرول نہ کر سکنا لیکن اسے جن دو وجوہ کی بناء پر اقتدار سے نکالا گیا ہے وہ مختلف ہیں۔ان میں سے ایک ہے اس کا پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی چاکری میں اس کی توقعات پر پورا نہ اترنا اور دوسرے امریکہ کو ناراض کرنا جس نے سیاسی جماعتوں، فوج، عدلیہ اور میڈیا کو اس کے خلاف متحد کر دیا اور اسے نکال باہر کیا گیا۔

ڈوبتا جہاز

مغربی فکر و تہذیب کے کپتان امریکہ کا جہاز ڈوب رہا ہے لیکن یہ ٹائی ٹینک ڈوبتے ہوئے بھی کم از کم ربع صدی مزید لے جائے گا اور اس وقت تک پاکستان جیسے اتھلے معاشروں کو (جن کی بنیاد ان کے عقیدے اور نظام حیات پر مضبوطی سے نہیں رکھی گئی) زیروزبر کرتا رہے گا۔

نیا استعمار

پھر اس کی جگہ چین کا نیا استعمار لے لے گا جس نے اپنے پاؤں ابھی سے مضبوطی سے پاکستان میں جما لیے ہیں۔وہ پاکستانیوں کا وہی حشر کرے گا جو وہ اس وقت مشرقی ترکستان (سنکیانگ) میں مسلمانوں کا کر رہا ہے۔

اٹھو اے پاکستانی مسلمانو! غفلت کی نیند سے جاگو

اپنے دین، ایمان، آبرو اور دنیا میں عزت کی زندگی کے لیے جاگو

تعلیم و تربیت ادارہ

یونیورسٹیوں میں بے دینی کے ماحول کا فروغ

آئی بی اے کراچی میں ہم جنس پرستوں کا پروگرام

آئی بی اے یعنی انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی کے حوالے سے یہ تشویشناک خبریں میڈیا میں آ رہی ہیں کہ اس ادارے میں ہم جنس پرست افراد نے ایک باقاعدہ پروگرام منعقد کیا۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ اس بارے میں زبان کھولنے کو تیار نہیں اور ادارے کے سربراہ اکبر زیدی صاحب میڈیا کی طرف سے رابطہ کرنے کے باوجود خاموش ہیں۔ یاد رہے کہ اکبر زیدی صاحب ایک معروف پولیٹیکل اکانومسٹ ہیں اور اپنے مخصوص خیالات کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ کئی این جی اوز کو مشاورت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ متعدد بین الاقوامی اداروں کے لئے کام کر چکے ہیں۔ اکبر زیدی صاحب کو ایک خطیر مشاہرے پر آئی بی اے میں تعینات کیا گیا تھا اور روٹین سے ہٹ کر ان کی تنخواہ اور مالیاتی پیکیج کی منظوری حکومت سے لی گئی تھی۔

آئی بی اے کے بارے میں کچھ لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خالصتاً ایک نجی ادارہ ہے جو باقی کئی نجی اداروں کی طرح لبرل انتظامیہ کے زیر اثر اس قسم کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہے جو پاکستانی معاشرے کی اسلامی و ثقافتی اقدار سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہ دراصل ایک غلط فہمی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن یعنی آئی بی اے ایک پبلک سیکٹر یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہے اور سال ۲۰۲۱ء اور ۲۰۲۲ء کے وفاقی بجٹ میں اس ادارے کے لئے ۱۵ کروڑ سے زیادہ کی رقم مختص کی گئی ہے۔ اس وقت ہم اس تفصیل میں نہیں جاتے کہ اپنے قیام سے لے کر آج تک آئی بی اے نے پبلک سیکٹر ادارے کے طور پر پاکستان کے ٹیکس کے کتنے وسائل استعمال کئے لیکن ایک پبلک سیکٹر ادارے میں جب ہم جنس پرستوں کو اجتماع منعقد کرنے کی کھلی اجازت دی گئی ہے تو یہ امر نہ صرف باعث تشویش ہے بلکہ یہ آئین پاکستان اور ملکی قوانین کی بھی سنگین خلاف ورزی ہے۔ پاکستان کے آئین کی رو سے یہ ملک اسلامی جمہوریہ ہے اور یہاں ریاست پر اسلامی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ اگر ریاستی وسائل کی بنیاد پر بنائے گئے اداروں میں ریاست کی طرف سے مقرر کردہ انتظامیہ کھلم کھلا اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے کی اجازت دیتی ہے تو یہ ناقابل قبول ہے۔

ریاستی ادارے بار بار تشدد اور عدم برداشت کے خاتمے کی بات کرتے ہیں مگر ہمیشہ کی طرح وہ ایک بار پھر ان عوامل کے تدارک میں پوری طرح ناکام رہے ہیں جو ردعمل کی نفسیات کو ابھارتے ہیں۔ جب آئین وقوانین کا احترام نہیں کیا جائے گا اور فحاشی ومنکرات کے شیطانی ایجنڈے کو لبرل ازم کے نام پر فروغ دیا جائے گا تو کبھی بھی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جامعہ کراچی سمیت ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں اسلام پسند طلباء وطالبات سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں۔ ان کے دینی جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے اور کوئی بھی ادارہ سنجیدگی سے اس معاملے کی سنگینی کو محسوس کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ تصادم اور ٹکراؤ کے علاوہ اور کیا نکلے گا؟

پاکستان کی جامعات میں عرصہ دراز سے ایک منظم طریقے سے ایسے عناصر کو پروان چڑھایا جا رہا ہے جو ایک طرف تو اسلامی اقدار اور دینی حمیت کی تضحیک کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ ریاست کی بنیادی پالیسیوں کو بھی چیلنج کرتے ہیں۔ لسانی تعصبات اور گروہی سیاست کے عنوانات سے یہ عناصر تقریباً ہر تعلیمی ادارے میں موجود ہیں اور ان کی غنڈہ گردی اور ریاست کی رٹ کو چیلنج کرنے کے باوجود آج تک ان کے خلاف موثر کاروائی نہیں کی گئی۔ ہم ہمیشہ سے اس موقف کے قائل رہے ہیں کہ پاکستان کی نظریاتی اساس اور اسلامی تشخص کے تحفظ کی واحد اور دیرپا حکمت عملی قانون کے موثر نفاذ اور عدل اجتماعی کے اسلامی تقاضوں پر عمل کرنے پر مشتمل ہے۔ اس اصول سے ہٹ کر ریاستی اداروں کی من مانی اور ماورائے قانون من پسند کاروائیاں کبھی بھی مثبت نتائج نہیں دے سکتیں۔ آئی بی اے کراچی کی طرح قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں بھی اطلاعات کے مطابق ہولی کی تقریب منعقد کی گئی۔ کلچر اور ثقافتی احیاء کے نام پر لسانی تنظیمیں نظریۂ پاکستان اور دوقومی نظریۂ کے خلاف اپنے عزائم کا کھل کر اظہار کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ طویل عرصے سے جاری ہے مگر ملک کی نظریاتی سرحدوں کے محافظین کی طرف سے خاموشی کے علاوہ کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔

ستم بالائے ستم یہ کہ ملک کے مایہ ناز تعلیمی ادارے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بھی کچھ عرصے سے اسی طرح کی لسانی وگروہی تعصبات پر مبنی پالیسیوں کو فروغ دیا جارہا ہے۔ یہ ادارہ جوامت مسلمہ کی علمی نشأۃ ثانیہ کے اہم ترین مشن کے لیے قائم کیا گیا تھا آج تیزی سے ان عناصر کے نرغے میں آرہا ہے جو اس کے مشن اور مقاصد کے سرے سے مخالف ہیں۔ پیغام پاکستان نامی بیانیے کی ترویج واشاعت کے نام پر اسلامی یونیورسٹی کے موقر ادارے، ادارہ

تحقیقات اسلامی، کو جس قسم کے کاموں پر لگا دیا گیا ہے اس کی ایک جھلک اس ادارے کے سربراہ ڈاکٹر ضیاء الحق اور یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر معصوم یاسین زئی کی حالیہ سرگرمیوں میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی ملی نغموں، گانوں اور ثقافتی پروگراموں کے نام پر وہ سب کچھ کر رہا ہے جس کا اس ادارے کے مینڈیٹ سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ ایک سنجیدہ علمی مینڈیٹ رکھنے والے ادارے اور اسلامی تشخص کی حامل یونیورسٹی کو اس وقت پست اور سطحی نوعیت کے پاپولزم میں مشغول کر دیا گیا ہے۔

ان حالات میں ملک کے ذمہ دار اور دردمند حلقوں کو آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستانی معاشرے میں تقسیم اور تشدد کی پہلے سے کوئی کمی نہیں۔ لبرل ازم کے نام پر ایسی حرکتوں کو فوری طور پر بند کرنا چاہیے جن سے معاشرے میں مزید غم وغصہ پیدا ہوتا ہے۔

[آخری خبریں آنے تک IBA کی انتظامیہ نے متعلقہ افراد کے خلاف کچھ ایکشن لیا ہے جو خوش آئند ہے۔]

بقیہ: یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر فراڈ

کبھی آپ نے فزیکل سائنسز پر اعلیٰ پائے کی کوئی کانفرنس کسی یونیورسٹی میں ہوتے دیکھی؟ نہ ان کاموں کے لئے گرانٹ ملتی ہے اور نہ کوئی مغربی ملک تعاون کرتا ہے، ماسوائے پاکستان کے ابتدائی ایام کے کہ جب بعض ممالک نے ہماری جامعات کے ساتھ بلاشبہ تعاون کیا۔ اب تو فزکس کے چند شعبوں میں پاکستانی طلبہ کو برطانوی اور بعض مغربی یونیورسٹیوں میں داخلہ بھی نہیں دیا جاتا۔

موجودہ چیئرمین ہائر ایجوکیشن کمیشن ڈاکٹر طارق بنوری کے ایک حالیہ انٹرویو سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں ان مذکورہ مسائل کا خوب ادراک ہے لیکن ان کے پاس مہلت عمل نہایت کم ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اساتذہ کی ترقی کا موجودہ غیر معقول طریقہ ختم کر کے وہ کوئی ایسا اسلوب متعارف کرائیں گے جو اساتذہ کو اصل ملکی اور معاشرتی مسائل سے جوڑ کر ان کا حل تلاش کرنے پر راغب کرے۔ فزیکل سائنسز کی مدد سے صنعتی ترقی بلاشبہ ملک کی ضرورت ہے لیکن سماجی علوم انسان کو انسان کے درجے پر رکھتے ہیں۔ ان دونوں میں توازن ضروری ہے۔ امید ہے کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن ان امور پر توجہ کرے گا۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر شہزاد اقبال شام[1]

یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر فراڈ

تحقیقی مقالوں کے نام پر پروفیسروں کی 'ترقیاتی مقالوں' کی دوڑ اور کاروبار

جب سے ایچ ای سی نے یونیورسٹیوں میں ترقی کے لیے تحقیقی مقالوں کی مقدار مقرر کی ہے یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر فراڈ اور کاروبار شروع ہوگیا ہے۔ایک آدمی مقالہ لکھتا ہے اور دوسروں سے پیسے لے کر ان کے نام بھی مصنفین میں شامل کردیتا ہے۔کچھ پروفیسروں نے ایچ ای سی سے منظوری لے کر ایسے رسالے شائع کرنا شروع کردیئے ہیں جن میں پروفیسروں سے جی بھر کر پیسے بٹورے جاتے ہیں اور ان کے مقالے شائع کیے جاتے ہیں۔معیار نہ ایڈیٹرز کا ہے،نہ رسالے کا اور نہ مقالوں کا۔اسی نظام کے خاتمے کی طرف فاضل مصنف نے توجہ دلائی ہے۔[مدیر]

"اب آپ کے پیش نظر کیا کام ہیں"۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر محمود غازی احمد (مرحوم) میری طرف دیکھنے لگے۔انہی کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ مکمل ہوئی تو اب وہ میرا آئندہ لائحہ عمل پوچھ رہے تھے۔ "جی! باقی کاموں کے ساتھ ساتھ ہر سہ ماہی میں ایک تحقیقی مقالہ تیار کروں گا"۔ موصوف دونوں ہاتھ گردن کی پشت پر رکھ کر ایک دو لحظے مجھے ناقدانہ انداز میں دیکھتے رہے، پھر بولے: "تین مہینے میں کس طرح کا تحقیقی مقالہ تیار کریں گے؟" ذرا مسکرا کر بولے: "لگتا ہے کوئی نئے تحقیقی اسالیب متعارف کرا رہے ہیں آپ۔ یاد رکھیے! چھ ماہ سے کم مدت میں تیار کسی شے کو تحقیق تو کہا ہی نہیں جاتا، اور یہ کم از کم مدت بتا رہا ہوں۔" عرض کیا: "جناب آج کل ترقی کے لئے ایسے ہی لگے بندھے تحقیقی مقالے درکار ہوتے ہیں۔" ہلکا سا روایتی قہقہہ لگا کر بولے: تو یوں کہیے نا کہ تحقیقی نہیں ترقیاتی مقالے آپ کے پیش نظر ہیں"۔

اب نوحہ کہاں سے شروع کروں۔ ملک میں گنتی کی کوئی ڈیڑھ درجن جامعات ہوا کرتی تھیں، لیکن بیشتر کے دائمی نقوش آج بھی تعلیم اور تعلم پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید عبداللہ تیس ضخیم جلدوں پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا "دائرہ معارف اسلامیہ" سماجی علوم کے

[1] پروفیسر (ر) بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محققین کے لئے قندیل راہ بنا چھوڑ گئے ہیں۔ یہ انسائیکلوپیڈیا اب بھی پنجاب یونیورسٹی کی شناخت ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف وتالیف نے وہ وہ گنج ہائے گراں مایہ تخلیق کیے کہ خاصا وقت گزرنے کے باوجود محققین ان سے آج بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کی بیشتر تحقیق تو دور وزارت کی ہے، لیکن اسلامی یونیورسٹی سے الحاق کے بعد بھی اس کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا رہا۔ ڈاکٹر غازی صاحب کے کوئی آٹھ سالہ جزوی دور میں شریعہ اکیڈمی کی کتب سو سے زیادہ چھپیں جو محققین کے لئے بطور حوالہ کام کرتی ہیں۔ ڈاکٹر انیس کی دعوہ اکیڈمی نے متعدد زبانوں میں سینکڑوں ایسی کتب تیار کیں، جن کے معاشرے پر گہرے نقش ہیں۔

۱۹۹۹ء میں آئین شکنی کیا ہوئی کہ ہر شعبۂ زندگی اُجڑے دیار کا منظر پیش کر رہا ہے۔ جامعات کا نگران ادارہ، ہائر ایجوکیشن کمیشن، کچھ ایسے خطوط پر استوار کیا گیا کہ حلوائی کی دکان پر دادا جان کی فاتحہ کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ اب کون سے ڈاکٹر سید عبداللہ؟ کیسے ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر انیس اور ڈاکٹر غازی؟ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے اچھے بھلے کام کرتے یونیورسٹی اساتذہ کو ان کے اصل کام چھڑوا کر نامعقول "ترقیاتی" مقالوں کے تعاقب میں لگا دیا۔ پانچ دس صفحات کے مقالے پر بسا اوقات آپ آٹھ دس "محققین" کے نام دیکھ سکتے ہیں۔ یہ "تحقیق" ہر استاد کے نامہ اعمال میں ایک تحقیقی مقالے کا اضافہ شمار ہوتا ہے۔ یوں وہ تیز رفتار اور پائیدار ترقی کی منزلیں طے کر کے پروفیسر بن جاتا ہے۔

رہے اصل کام کرنے والے مجنون سودائی اور سر پھرے پروفیسر تو ان کی ترقی "ترقیاتی" مقالوں کے بغیر ناممکن ہو کر رہ گئی ہے۔ گجرات یونیورسٹی کے ایسے ہی ایک مفتون کو کہیں سے سن گن ملی کہ بلیکس لا ڈکشنری کے ترجمے میں کچھ میرا بھی حصہ ہے تو "سرپرستی" کے نام پر اس نے مجھے گھیر لیا، اس کا کام دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ ڈاکٹر غلام علی گجرات اور قرب و جوار سے درجنوں اہل افراد کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر، انہیں تربیت دے کر دن بھر ہی نہیں تین شفٹوں میں ان سے کام لے رہے تھے۔ دو تین دفعہ میں نے وہاں رات بھر جاگ کر "قیام" کیا۔ لگتا تھا جی ایچ کیو کا وار روم ہے جہاں دشمن سے مقابلہ کی سی کیفیت ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ بیس پچیس ہزار صفحات پر مشتمل پنجاب کے سینکڑوں قوانین کو اصول ترجمہ کے چھ درجوں سے گزار کر یہ جونیئر استاد پنجاب حکومت کے حوالے کر چکا ہے۔ چھ پروفیسروں کے دس صفحات نہیں، غور سے پڑھیے، پچیس ہزار صفحات!

اور جنونی اندازِ کار ملاحظہ ہو: "سر مسودہ آپ کی نظر ثانی کے لیے تیار ہے۔ گجرات بائی پاس سے آپ کے گزرنے پر میرا آدمی رات سوا نو بجے آپ کو مسودہ دے دے گا۔ ڈاکٹر صاحب پلیز! اسلام آباد جا کر تین چار دنوں میں اسے دیکھ لیجئے: اسی جگہ سے وہی آدمی آپ سے مسودہ واپس لے گا"۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر غلام علی آپ کا کام تو پروفیسروں سے بڑھ کر ہے۔ آپ اب تک اسسٹنٹ پروفیسر کیوں ہیں؟ "سر! تحقیقی مقالے پورے نہیں ہیں۔ سر! پیپر پورے کرنے کے لئے اتنا وقت کہاں؟ ہو جائیں گے کبھی۔ ہاں! یہ دیکھئے سر! اس مسودے میں مترجم نے برات ہمزہ کے بغیر لکھا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟" یہ کہہ کر وہ سوختہ جگر میری ترقیاتی باتیں نظر انداز کر کے اپنے سودائے خاص کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ایچ ای سی نے وہ ناقابل فہم پالیسی متعارف کرائی ہے کہ جم کر ٹھوس موضوعات پر لکھی گئی کتاب بھی استاد کی ترقی میں کوئی کام نہیں آتی، چاہے اس کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو جائے۔ حد تو یہ ہے کہ ترقی کے لئے جامعات یہ بھی پوچھتی ہیں کہ استاد نے (کشکول اٹھا کر) مالی امداد کتنی حاصل کی۔ غیر ممالک اور این جی او سے تحقیق کے نام پر ملنے والی اس خطیر رقم سے جامعات میں اور دیگر شہروں میں جا کر کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے ہیں۔ وائس چانسلر، ڈین اور صدر شعبہ مہمان خصوصی ہوتے ہیں، پلاؤ کھائیں گے احباب، تحقیق کا فاتحہ ہوگا۔ کی گئی افلاطونی تقاریر سے "تحقیقی" مقالے تیار ہوتے ہیں اور استاد کی ترقی ہو جاتی ہے۔

یہ بیرونی ادارے جامعات کو دو مقاصد کے لئے اندھا دھند گرانٹ دیتے ہیں: تعلیمی جاسوسی (Academic Espionage) ان کا پہلا مقصد ہوتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کو اپنے فکر و فلسفے کے مطابق استوار کرنے کی خاطر مغربی ممالک کو طرح طرح کے اعداد و شمار اور معلومات کی مختلف شکلیں درکار ہوتی ہیں جن سے وہ ہماری پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی حکمت عملی بناتے ہیں۔ تحقیق، سروے اور میل جول کے ذریعے یہ مغربی ممالک ہر سطح پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان ممالک کا دوسرا مقصد ذہین اور محنتی اساتذہ کو اصل کام سے ہٹا کر بے مقصد مشاغل میں لگانا ہوتا ہے۔ آج بلھے شاہ کانفرنس تو کل شاہ ہمدان کانفرنس، پھر ایک سیمینار تصوف پر۔ آپ نے کسی یونیورسٹی میں اس پیٹر ہگز پر کبھی کوئی سیمینار ہوتے دیکھا جس کے تصور گاڈ پارٹیکل نے طبعیات کی دنیا میں بھونچال برپا کر رکھا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۷)

تعلیم و تربیت

سید خالد جامعی

عورت اور تعلیم

لڑکیوں کا نصاب لڑکوں سے الگ ہونا چاہیے

* طالبان رہنما وحید اللہ ہاشمی نے ہیومن رائٹس امپیریل ازم کو مسترد کرتے ہوئے یہ اعلان کیا ہے کہ شریعت مرد اور عورت کو ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی لہٰذا عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات صرف طالبان ہی کہہ سکتے تھے۔ ہیومین رائٹس عورت و مرد کی مساوات کے قائل ہیں۔ اسی لیے دنیا بھر کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حتیٰ کہ اسلامی تعلیمی اداروں میں بھی عورت اور مرد کا نصاب ایک جیسا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عورت و مرد ایک جیسی ملازمت کریں گے۔ ایک جیسے کام کریں گے۔ ان میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ ملائیشیا، ترکی، سعودی عرب، سوڈان اور پاکستان کے اسلامی تعلیمی اداروں کا نصاب بھی ایسا ہی ہے۔

* لبرل ازم کے سب سے بڑے فلسفی جان رالس نے اپنی آخری کتاب *Law of the Peopel* میں لکھا ہے کہ چین نے خواہ مخواہ ایک بچے کی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے جبر، تشدد، ظلم کے ہتھکنڈے کو اختیار کیا، وہ ہیومین رائٹس نافذ کر دیتا تو عورت ایک ہی بچہ پیدا کرتی۔ کیرالہ کی ریاست نے یہ تجربہ کیا اور کامیاب رہی وہاں کی عورت مشکل سے ہی ایک بچہ پیدا کرتی ہے۔

* آج چین عورتوں کو مراعات دے رہا ہے، مالی امداد دے رہا ہے، زیادہ بچے پیدا کرنے کی مہم چلا رہا ہے لیکن اب چینی عورت مغربی علم اور ہیومین رائٹس حاصل کر کے باشعور ہو گئی ہے۔ وہ ترقی کرنا چاہتی ہے، تعلیم یافتہ بننا چاہتی ہے اور ایک بچہ بھی پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ یہی حال جاپان، فرانس، اٹلی اور جرمنی کا ہے۔

* اسلام نے عورت و مرد کا دائرہ کار الگ الگ بنایا ہے تو عورت کو وہی تعلیم کیوں دی جائے جو مرد کو دی جائے؟ مرد جیسی تعلیم اٹھارہ سال تک عورت کو دینے کے بعد اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ مرد جیسے کام نہ کرے گھر میں بیٹھے، اچھی ماں بنے، بہترین نسل تیار کرے متضاد رویہ

ہے جو مسائل پیدا کرتا ہے۔ حالت اضطرار کے تحت کچھ دائروں میں عورت کی خدمات لی جاسکتی ہیں لیکن زندگی کے ہر دائرے پر حالت اضطرار کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اضطرار کو دوام عطا نہیں کیا جاسکتا۔

* عورت و مرد مارکیٹ میں کام کریں گے تو ڈے کیئر سینٹر، کلب، اولڈ ہوم بھی کھلیں گے، یقیناً مادی ترقی ہوگی لیکن خاندانی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ دنیا بھر کا تجربہ یہی ہے۔

* عالم اسلام میں جتنی کتابیں آ رہی ہیں وہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے حقوق پر آ رہی ہیں۔ کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آتی جو مردوں کے حقوق پر ہو۔ اس کی وجہ پر غور کرنا چاہیے۔ مغرب میں ایسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جس میں مرد کو بھلائی گئی مخلوق (Forgotton Specie) ثابت کیا جارہا ہے۔

* اسلام میں حقوق عورت مرد کے (یعنی فرد [Individual] کے) نہیں رشتوں کے اور عبد کے حقوق ہوتے ہیں، کیوں کہ اسلام میں فرد تنہا نہیں ہوتا، وہ کسی رشتے سے تعلق رکھتا ہے۔ فرد ایک طرف اللہ سے تعلق رکھتا ہے تو دوسری طرف مخلوق سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں رشتوں سے کچھ حقوق نکلتے ہیں؟ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ لیکن ان حقوق کی شرط یہ ہے کہ فرد تنہا تجریدی وجود (Abstract Entity) نہ ہو بلکہ تعلقات کے تانے بانے میں موجود وجود ہو۔

ہیومین رائٹس جس فرد کی بات کرتے ہیں وہ تنہا اکیلا سب سے الگ آزاد وجود ہے جو کسی تاریخی، مذہبی، تہذیبی، قبائلی، روایتی، خاندانی رشتے میں منسلک ہی نہیں۔ وہ ان سب رشتوں اور اجتماعیتوں کو توڑ کر اٹھارویں صدی میں مغربی فلسفے کے ذریعے پیدا کیا گیا ہے۔ اسلامی علمیت اور کوئی روایتی علمیت فرد کے اس جدید مغربی تصور کو تسلیم ہی نہیں کرسکتی۔

حجاب، نقاب، پردہ اس عورت کے لیے ہے جو کسی شرعی ضرورت، کسی مجبوری کے تحت گھر سے باہر نکلتی ہے۔ جو عورت سوچ سمجھ کر بارہ گھنٹے مردوں کے درمیان بیٹھتی ہے، اس کا حجاب، نقاب کیسا؟ ایسی عورت کے ذریعے خاندانی نظام کو منتشر ہونے سے بچایا ہی نہیں جاسکتا۔

طالبان کے سینئر رہنما وحید اللہ ہاشمی نے مخلوط تعلیم کے حوالے سے بیان دیا ہے کہ ایک چھت کے نیچے اجنبی مرد عورت کا اکٹھا ہونا شریعت کے مطابق نہیں۔ عصر حاضر میں اس جرأت، غیرت کا اظہار طالبان ہی کرسکتے تھے انہوں نے یہ کام کر دکھایا۔ وہ مغرب سے کہہ رہے ہیں کہ ہم تمہارے ہیومین رائٹس امپریل ازم کو تسلیم نہیں کرتے۔ مغرب کے پوسٹ ماڈرن فلسفی کہہ

رہے ہیں کہ مغرب اور ماڈرن ازم کے عقیدے عقلیت پرستی، آزادی، مساوات، ترقی آفاقی عقیدے نہیں یہ خاص تاریخ سے نکلے ہیں۔ پوسٹ ماڈرن ازم نے مغرب کے تمام اعتقادات تمام اداروں اور مغرب کی علمی وادارتی صف بندی پر بنیادی نوعیت کے سنگین اعتراضات اٹھا دیئے ہیں۔ وہ ہیومین رائٹس کو بھی آفاقی نہیں مانتے۔ ہیومین رائٹس کی حقیقت جاننے کے لیے دو کتابیں پڑھ لیجیے:

Beyond Human Rights

On Human Condition

ہیومین رائٹس میں جس فرد کو Rights دیئے گئے ہیں وہ کسی تہذیب اور تاریخ میں وجود ہی نہیں رکھتا۔ ہر تہذیب میں فرد تنہا وجود نہیں رشتوں کی زنجیر میں شامل وجود ہے وہ Abstract Individual نہیں۔ اس کی تاریخ ہے، اس کی اجتماعیت ہے۔ اس کی پہچان، شناخت اس کا قبیلہ، برادری، ذات، کام، خاندان، مذہب، روایت ہے۔ ہیومن رائٹس ایسی کسی مذہبی، روایتی، تاریخی اجتماعیت کو تسلیم ہی نہیں کرتے وہ کہتے ہیں تمام رشتوں سے تعلقات توڑو، اجتماعیت کے گورکھ دھندے سے باہر نکلو، صرف خود کو پہچانو، خود کے لیے جیو اور آزاد وجود بن جاؤ۔ لہٰذا لبرل ازم جہاں بھی جاتا ہے سب سے پہلے تمام اجتماعیتوں کو ختم کر کے فرد کو خاندان سے توڑ کر ایک آزاد وجود بنا کر سول سوسائٹی قائم کر کے حقوق عطا کرتا ہے۔ طالبان کو چاہیے کہ مغرب کو کہہ دیں کہ تم ہمیں عورت کے بارے میں سبق نہ پڑھاؤ، ہم جانتے ہیں کہ مغرب نے عورت کو کتنا احترام دیا ہے؟ اسے ایک Commodity میں تبدیل کر دیا ہے جو خریدی اور بیچی جا رہی ہے۔ ہمیں احترام وعزت کے اسباق پڑھانے کی ضرورت نہیں، اپنے کام سے کام رکھو!

لَا اِلٰہَ	اِلَّا اللّٰہ
نہیں کوئی اِلٰہ	سوائے اللہ کے
یعنی کوئی عبادت اور اطاعت کے لائق نہیں	سوائے ایک اللہ کی ذات کے
یعنی رد کر دو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کو	اور پیروی کرو صرف اسلام کی

تعلیم و تربیت پروفیسر عاصم حفیظ

تعلیم کے سوداگروں کی کارستانیاں
اساتذہ کا بدترین استحصال

ہم اپنی نوجوان نسل کی تربیت کیسے کر رہے ہیں؟ انہیں کیا سکھا رہے ہیں؟ اس کی ایک جھلک پرائیویٹ سکولز بھی ہیں۔ اگر یہاں بچوں کو داخل کرانے جائیں تو ان کا اخلاق دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اخراجات کی لمبی فہرست۔ ایڈوانس فیس اور سالانہ اخراجات۔ ایڈمیشن اور دیگر لوازمات۔

لیکن اس دھندے کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ یہ اپنے ٹیچرز کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ اول تو اعلی تعلیم یافتہ ٹیچرز کو انتہائی کم تنخواہوں پر رکھتے ہیں۔ اور جیسے ہی گرمیوں کی چھٹیاں قریب آتی ہیں تو ٹیچرز کو نکال دیتے ہیں۔ بڑا احسان کریں تو یہ آپشن ہوتی ہے کہ ان چار سے پانچ ماہ کی تنخواہ نہیں ملے گی۔ میں گلی محلے کے چھوٹے چھوٹے سکولز کی بات نہیں کر رہا کہ جن کی آمدن محدود اور وہ واقعی مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ 'برانڈز' کی بات ہے۔ جو کئی ماہ پہلے سے ہی گرمیوں کی چھٹیوں کی فیسز زبردستی وصول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ذرا سی فیس لیٹ ہو تو معصوم بچوں کو کلاس سے نکال کر اذیت دیتے ہیں۔ یہ ہے ان کی اعلی تربیت کا اہتمام۔ شائد انہیں پہلے انسانیت سیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم ان نوجوانوں کو جو کہ ابھی ڈگریاں لے کر فیلڈ میں آئے ہی ہوتے ہیں انہیں سبق دیتے ہیں کہ اس معاشرے میں کیسے جینا ہے۔ انہیں بے ایمانی اور دھوکہ سکھاتے ہیں۔ سنگدلی سکھاتے ہیں۔ جب کسی کو یوں اچانک نوکری سے محروم کر دیا جائے تو اس کے جذبات کیا ہوں گے؟ اور یہ سب، سب سے معزز پیشے کے سوداگروں کی کارستانیاں ہوتی ہیں۔

ہمارے ہاں حکومتی رٹ اور سرکاری چیک اینڈ بیلنس تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ خصوصا پرائیویٹ سکولز کے حوالے سے تو کوئی بھی لیبر لاز، کچھ بھی قواعد موجود ہی نہیں۔

یقین مانیں ہمارا مسئلہ معاشی سے زیادہ اخلاقی ہے۔ ہم وسائل کی کمی سے کہیں زیادہ

انسانیت کی کمی کا شکار ہیں۔ اپنے لالچ کی خاطر اخلاقیات بھول جاتے ہیں۔ یہ شائد مکروہ ترین دھندہ ہے۔ چوری ڈاکے اور دیگر جرائم سے بھی بڑھ کر گھٹیا حرکت ہے۔لیکن ایسا کرنے والے تو معزز ٹھہرتے ہیں۔کاش ہم ایسے سفید ڈاکوؤں اور مجرموں کو اور نہیں تو کم سے کم بے نقاب کرنا اور احساس دلانا ہی شروع کردیں۔ یہ شعور بیدار کریں کہ یہ تعلیم کے سوداگر دراصل سفید ڈاکو ہیں۔ بےشرم، انسانیت سے عاری اور اس معاشرے کے ناسور۔ جو خود تو کمائی کر لیتے ہیں اور جن اساتذہ کی بدولت یہ دولت ملی انہیں جائز حق بھی نہیں دیتے۔ ان سنگ دلوں سے کوئی پوچھے والدین تمہاری شکلیں دیکھ کر چھٹیوں کی فیس دیتے ہیں یا ان اساتذہ کی سال بھر محنت اور ان سے ہی اپنے بچوں کو پڑھانے کی بدولت؟ اگر تم انہیں جائز معاوضے اور حق سے محروم رکھتے ہو تو یہ چوری ہے،ڈاکہ ہے، جرم ہے اور کسی کا حق مار کر حرام کی کمائی ہے۔

الفاظ کچھ سخت بھی لکھے گئے لیکن یقین مانیں جب تک ہم جرم کو جرم اور مجرم کو احساس نہیں دلائیں گے تو شائد ہم بھی مجرم ٹھہریں گے اور شریک جرم بھی۔ ہمارے الفاظ شائد کسی کو اس کا جائز حق نہ دلا سکیں لیکن یہ احساس زندہ رہنا چاہیے کہ تعلیم اور مقدس پیشے میں لپٹا یہ جرم ہے۔گھٹیا اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔

الحمدللہ

ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں جس نے شفقت محمود جیسے سیکولر اور لبرل وزیر تعلیم سے پاکستانی نظام تعلیم کی جان چھڑائی جو اسلام اور نظریہ پاکستان کی بجائے سارے پاکستان کے سیکولر اور لبرل دانشوروں کو اکٹھا کر کے نصاب میں ہیومنزم اور سیکولرازم کی اقدار سمو رہے تھے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آئندہ ہمیں کوئی ایسا ماہر تعلیم وزیر عطا فرمائے جو کوالٹی اور پروفیشنل ازم کے ساتھ ذہناً مسلمان ہو،مغرب سے مرعوب نہ ہو اور ہمیں انگلش میڈیم اور انگریزی زبان و کلچر کے غلبے سے بچائے اور اسلام،نظریۂ پاکستان اور اُردو کا حامی ہو۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر یاسر ندیم الواجدی[1]

دینی مدارس - مدرسہ ڈسکورسز پروگرام سے ہوشیار رہیں

پاکستان اور بھارت کے دینی مدارس کے طلبہ کو جدیدیت سے بہرہ ور کرنے کا متجددین کا پروگرام

آج ہی ایک اشتہار دیکھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوٹ آف ریلیجس اینڈ سوشل تھاٹ کے اشتراک سے مدرسہ ڈسکورسز انڈیا کا پروگرام منعقد ہو رہا ہے۔ اس طرح کے پروگرام دن رات منعقد ہوتے ہیں، لیکن جو چیز قابل توجہ تھی، وہ مہمان ذی وقار کا نام تھا: پروفیسر ابراہیم موسیٰ۔ کلیدی خطاب کے طور پر مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کا نام بھی درج تھا۔

مَیں کل ہی یہ سوچ رہا تھا کہ پاکستان میں غامدی فکر کے ترجمان عمار خان ناصر صاحب کے زیر انتظام مدرسہ ڈسکورسز نے اپنے وجود کا احساس دلا کر ابھی تک انڈیا کا رخ کیوں نہیں کیا، لیکن افسوس کہ چند گھنٹوں میں ہی یہ انکشاف ہو گیا کہ انڈیا کا نہ صرف یہ کہ رخ ہو چکا ہے بلکہ پروگرام کے تئیں مذہبی حلقوں میں اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک بڑی علمی شخصیت کو دعوت بھی دے دی گئی ہے۔

مدرسہ ڈسکورسز آخر ہے کیا؟ اس کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس پروگرام کے پیچھے کون سا ادارہ ہے؟ امریکہ کی سب سی بڑی کیتھولک یونیورسٹی نوٹر ڈیم جو امریکی صوبے انڈیانا میں واقع ہے دراصل اس پروگرام کی محرک ہے۔ اس یونیورسٹی کے ایک ذیلی ادارے کے پروفیسر ابراہیم موسیٰ جو اصلاً جنوبی افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں، مدرسہ ڈسکورسز کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ اس پروگرام کے دوسرے ذمہ دار ہیں پروفیسر ماہان مرزا صاحب۔ ان دونوں شخصیات کے نظریات پر کچھ کہنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مدرسہ ڈسکورسز نامی اس پروگرام کا مقصد کیا ہے۔ نوٹر ڈیم یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر اس پروگرام کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ: 'اس پروگرام کا مقصد علماء کو پلورلزم، جدید سائنس، اور جدید فلسفہ سے آراستہ کرنا ہے۔'

پلورلزم (Pluralism) ایک جدید اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے: 'یہ نظریہ رکھنا کہ میرا

[1] بھارتی دانشور مقیم امریکہ

مذہب ہی سچائی کا مصدر نہیں ہے، بلکہ حق دیگر مذاہب میں بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح یہ نظریہ رکھنا کہ مختلف مذاہب ایک عالمگیر سچائی کی الگ الگ تعبیرات ہیں'۔گویا اسلام کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، بلکہ مسیحی اور یہودی مذاہب بھی درست ہیں کیوں کہ وہ حقانیت ہی کی دوسری تشریح ہیں۔اس نظریے کو جدید ترین اصطلاح میں پرینیلزم (Perennialism) بھی کہا جاتا ہے۔لہٰذا مدرسہ ڈسکورسز میں فضلائے مدارس کو داخل کر کے یہ تربیت دی جائے گی کہ پلورلزم پر کیسے ایمان لایا جاسکتا ہے اور کیسے یہ جاہلی نظریہ آج کے دور میں ضروری ہے۔

اس پروگرام کے ذمہ داران نے اپنی فیس بک پروفائل پر چند تصاویر نشر کی ہیں۔سترہ جون کی پوسٹ میں ماہان مرزا ان تصاویر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ'مدرسہ پروجیکٹ پر ایک سیمینار کی میزبانی پر خوش ہوں۔سیمینار میں اس میدان کے عظیم اسکالرز نے ابراہیم موسیٰ کی سرپرستی میں شرکت کی'۔اب ذرا اس مختصر سے سیمینار میں شریک دو تین شخصیات کے حالات ملاحظہ کیجیے تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ ایک عیسائی یونیورسٹی کو ہمارے مدارس کے فضلاء کے مستقبل کی فکر کیوں ہے!

۱۔ محمد فضل: یہ صاحب ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور شریعت میں ہم جنس پرستوں کے نکاح کے لیے گنجائش تلاش کرنے کے حوالے سے امریکی مسلم حلقوں میں مشہور ہیں۔

۲۔ سعدیہ یعقوب: یہ محترمہ'فتنہ'نامی مسلم فیمنسٹ گروپ کی شریک بانی ہیں۔اس گروپ کا فیس بک پیج بھی ہے جس پر وقتاً فوقتاً علماء اور مذہبی حلقوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔یہ گروہ اسلام کی نسوانیت پسند تشریح کے لیے مشہور ہے۔

۳۔ ماہان مرزا خود بھی پروگریسو مسلم یونین نامی تنظیم میں شامل ہیں۔اس تنظیم کے وکی پیڈیا پیج پر صاف لکھا ہے کہ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ مساجد میں خواتین کی امامت میں اقتداء درست ہے۔۲۰۰۵ء میں امینہ ودود نے ایک چرچ میں جمعہ کی امامت کر کے پوری دنیا کے اخبارات کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔یہ تنظیم امینہ ودود کی علی الاعلان حمایت کرتی ہے۔اس تنظیم کے بانی کا نام ہے امید صفی۔

ماہان مرزا اور امید صفی زیتونہ کالج کے مجلّے "رینوٹیو" (Renovative) کے ادارتی بورڈ میں شامل ہیں۔رینوٹیو لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تجدید کے ہیں۔یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ نوٹرڈیم نے مدرسہ ڈسکورسز والے پیج پر تجدید نامی ایک اردو مجلّے کا لنک بھی دیا ہوا ہے جو

یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوتا ہے اوراس کی ادارت انڈیا کے ڈاکٹر وارث مظہری انجام دیتے ہیں۔معاون ایڈیٹر کے طور پر عمار خان ناصر کا نام ہے جواس وقت غامدی فکر کے بڑے ترجمان ہیں اورالمورد پاکستان کے ذمے داران میں سے ایک ہیں۔

ماہان مرزا جس زیتونہ کالج سے وابستہ ہیں اس کے ذمہ دار حمزہ یوسف ایک مشہور مقرر ہیں لیکن اپنی زندگی کے مختلف اور متضاد اطوار کے لیے جانے جاتے ہیں۔حال ہی میں ٹرمپ انتظامیہ کے مشیر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا ہے۔ان کے استاذ عبداللہ بن بیہ ایک مشہور علمی شخصیت ہیں۔ان کی سرپرستی میں چند ماہ پہلے دبئی میں پلورلزم کے عنوان کے تحت حکومت کی ایماء پر عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ مدرسہ ڈسکورسز کے ڈائریکٹر ابراہیم موسی دبئی کانفرنس کے مداحین میں شامل ہیں۔

اس کے بعد عبداللہ بن بیہ کی موجودگی میں پوپ نے مراکش کا دورہ کیا اوراس کے سامنے اذان اور چرچ کا گانا دونوں ایک ساتھ پڑھے گئے۔یوٹیوب پراس کی ویڈیو موجود ہے۔مفتی تقی عثمانی نے اپنے ٹویٹر ہینڈل کے ذریعے اس فکر کے خلاف آواز بلند کی تھی۔

چند روز قبل مدرسہ ڈسکورسز پاکستان کے تحت منعقد ہونے والے پروگرام کی روداد بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔اس پروگرام میں شامل چند مقررین نے جس طرح اپنی فکر کا اظہار کیا اس کے بعد اس گروہ کے عزائم جاننے کے لیے کسی گہرے انویسٹی گیشن کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ سب تفصیلات اس لیے درج کی ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ مدرسہ ڈسکورسز کے نام پر علماء کو بھرتی کرکے انھیں کس طرح ڈھالے جانے اور پھر استعمال کرنے کی کوششوں کا آغاز پاکستان کے بعد انڈیا میں ہونے جارہا ہے اور مغرب کیسے اس جاہلی فکر کو مختلف طریقوں سے اسلامی مشرق پر مسلط کررہا ہے۔ یہ واضح رہے کہ سعودی اسکولوں میں نصاب تعلیم واشنگٹن سے تیار ہوکر آرہا ہے لیکن یہ جبر انڈیا اور پاکستان میں ممکن نہیں ہے۔اس لیے یہ طاقتیں اسٹریٹیجی بدل کر مدارس سے وابستہ مذہبی حلقوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ہمارے علمائے کرام ہوسکتا ہے کہ ان عزائم سے ناواقف ہوں۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہونے والے اس پروگرام سے پہلے علمائے کرام کو حقیقت سے آگاہ کردیا جائے۔اس بات کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہے۔

تعلیم وتربیت مدیر

جدیداسلامی تحریک۔تعلیم وتزکیہ کی اہمیت؟

تبصرہ: پہلے میرا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ مل کر تعلیم کا کام کروں لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ آپ کی دلچسپی بعض دوسرے امور میں بھی ہے تو دینی تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول ہوگیا۔

البرہان

میں عملاً ۳۵ سال سے اصلاحِ تعلیم کے کام میں لگا ہوا ہوں اور تدریس کے ساتھ تھوڑا بہت اتحاد بین العلماء کا کام کرتا ہوں۔اس کے علاوہ میری کوئی عملی سرگرمی نہیں۔ہاں فکری سرگرمی ضرور ہے جس میں میرے بنیادی محورتین ہیں: تعلیم وتزکیہ، ردّ مغربی فکر وتہذیب اور پاکستان و اسلام۔

محترم کا تعلق جدید اسلامی تحریک سے ہے اور نہایت فاضل شخصیت ہیں۔ہم ایسے فاضل لوگوں کے تعاون سے اس لیے محروم ہیں کہ برصغیر میں جدید اسلامی تحریک کے بانی (سید مودودیؒ) نے اقامت دین کا جو تصور پیش کیا اس میں تعلیم وتزکیہ کی اہمیت برائے نام ہے اور سارا زور اسلامی سیاست وریاست پر ہے۔

دوسرے یہ کہ راقم ،اس کے باوجود کہ وہ مولانا مودودی مرحوم کا ان کے تبحر علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے بہت احترام کرتا ہے،ادب کے ساتھ ان سے فکری اختلاف بھی رکھتا ہے اور اس کے اظہار کو دینی مصلحت وضرورت بھی سمجھتا ہے۔اس لیے وہ اسلامی تحریک کے پیروکاروں کی نظر میں معتوب اور مبغوض قرار پاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کشمکش میں سے ہمارے لیے خیر کا کوئی راستہ نکالے۔

فہم دین

سید خالد جامعی

رمضان المبارک سے صحیح استفادے کے موانع

ہمارے غلط رویوں نے ہمیں رمضان المبارک سے صحیح استفادے کے قابل نہیں رہنے دیا

رمضان المبارک میں رات بھر جاگ کر کھاتے رہنا، گھومتے رہنا، خریداریاں کرنا اسلام کی روایت نہیں ہے۔ اکثر دین دار لوگ عید کے دن فجر کی نماز سے محروم رہتے ہیں کہ رات کو خریداری میں مصروف تھے۔ کاروباری حضرات بھی فجر اور عید کی نماز سے محرم رہتے ہیں کہ رات بھر فروخت میں مشغول رہے اور آتے آتے وقت نکل گیا یا طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ ہوٹلوں میں رمضان پیکج لوٹ مار کا نیا طریقہ ہے۔ رمضان میں ہوٹل ویران ہوجاتے تھے لہذا ان کو آباد کرنے کے لئے کئی سال پہلے رمضان پیکیج کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس سے پہلے اکثر ہوٹل بند رہتے تھے۔ ہوٹل والوں کا خیال تھا کہ لوگ روزے میں کم کھائیں گے لہذا فائدہ بھی زیادہ ہوگا اور پیکج میں دام کم کر کے زیادہ صارفین مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا اب رمضان میں ہوٹل فجر تک بھرے رہتے ہیں، دین دار خاندان یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ہوٹلوں میں کھانے پینے کی ثقافت، روایت اور وہ بھی رمضان جیسے مقدس مہینے میں تباہ کن ہے 'اس میں کیا حرج ہے'؟ کے فلسفے کے تحت حلال کر لی گئی، ہوٹل والا صارفین کو لوٹنا چاہتا ہے، صارفین ہوٹل والے کو لوٹنا چاہتے ہیں کہ جتنا مال دیا ہے اس سے زیادہ کھا لیں لہٰذا افطاری اور سحری اب ہوٹلوں میں ہو رہی ہے۔ نہ نماز کا اہتمام، نہ پردے کا خیال، نہ رمضان کے تقدس کی اہمیت۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ کھانے میں مصروف ہے حالانکہ رمضان میں اگر ہوٹلوں میں مفت کھانے کی بھی پیش کش ہو تب بھی رمضان المبارک کا تقاضا یہ ہے کہ اس دعوت کو رد کر دیا جائے اور گھروں اور مساجد تک محدود رہ کر اس ماہ کی برکات سے استفادہ کیا جائے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے گھر (مساجد) بہت پسند اور دنیا کے گھر یعنی بازار سخت نا پسند تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت رمضان المبارک کا مہینہ بازاری سرگرمیوں میں گزار کر سنت کی تقلید کر رہی ہے یا اپنی خواہش نفسانی کی؟ ہوٹلوں میں یہ افسوسناک منظر بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ افطاری اور کھانے کے پیکج سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے یا کھانا پسند نہیں آتا تو کھانا لے کر ضائع کرتے اور انتقام کی آگ بجھاتے ہیں۔ جدیدیت کا ثمر یہ حاسد، حریص اور ہوس کا پجاری انسان ہے جو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے اور ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ

سمیٹنے میں مصروف ہے۔قرآن کریم کے الفاظ میں جس کے لینے کے پیمانے اور ہیں اور دینے کے پیمانے کچھ اور۔قرآن کریم ایسے لوگوں کو تباہی کی نوید سناتا ہے ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝﴾ [المطففین ۸۳: ۱ تا ۳] رمضان صبر کا، ضبط کا اور تزکیہ نفس کا مہینہ ہے مگر رات بھر دین دار لوگ ہوٹلوں میں کھانے کھاتے ہیں، جہاں بے پردگی اور بے حیائی عام ہوتی ہے اور عبادت وسکون کا کوئی لمحہ میسر نہیں ہوتا، صرف اس لیے کہ کھانا سستا ہو گیا ہے۔کے ایف سی میں رات بھر گاڑیوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں۔رات گئے کے ایف سی کے دام گر جاتے ہیں تو سستا کھانے کے شوقین یہاں نقب لگاتے ہیں۔افسوس کہ رات کو کے ایف سی وہی پہنچ سکتے ہیں جن کے پاس اپنی سواری ہو یعنی لوٹ مار کے اس عمل میں امراء ہی شریک ہو سکتے ہیں غربا نہیں۔

تاریخ انسانی کے کسی معاشرے کے امراء اتنے حریص، حاسد اور لالچی نہیں تھے جس قدر عصر حاضر کے امراء ہیں، دین دار لوگ بھی رات کے وقت کے ایف سی کے سستے کھانے کے لئے یلغار کرتے ہیں، یہ فساد فی النفس کی انتہا ہے کاش کہ ان دین دار لوگوں نے بھی پرندوں کی زندگی سے عبرت حاصل کی ہوتی۔کوئی پرندہ مغرب کے بعد کچھ نہیں کھاتا، آپ اسے کسی قسم کا پیکج دے دیں، لالچ دے دیں، وہ اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتا ہے۔پرندے رات گئے کھانا کھانا پسند نہیں کرتے مگر عہد حاضر کا انسان جو تاریخ کا واحد انسان ہے، جانوروں اور پرندوں سے گیا گزرا ہو گیا ہے۔جانوروں کو رات گئے کے ایف سی مفت پیکج مہیا کیا جائے تب بھی وہ اپنے مساکن اور آشیانوں سے باہر نہیں نکلیں گے مگر جدید عہد کا جدید جانور (Modern Man) رات کی نیند ترک کر کے، تہجد چھوڑ کر، اسلامی روایات کو نظر انداز کر کے، صرف سستے چٹخاروں کے لئے گلی کوچوں میں آوارہ پھر رہا ہے۔دنیا کی سترہ تہذیبیں راتوں کو اس طرح خورد و نوش کرنے کے تصور سے عاری تھیں، راتوں کو کھانا پینا صرف اور صرف جدید سائنس وٹیکنالوجی نے ممکن بنایا ہے۔اس نے ہزاروں سال کی تہذیب و تاریخ بدل دی ہے۔بیسویں صدی سے پہلے تاریخ انسانی میں کوئی انسان راتوں کو کھانا کھانے کے لئے باہر نہیں نکلتا تھا۔جدید سائنس وٹیکنالوجی کے آلات نے اس غیر فطری زندگی کو عین فطری زندگی بنا کر دکھا دیا ہے۔پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ جدید سائنس وٹیکنالوجی غیر اقداری ہے حالانکہ یہ سراسر اقداری (Value Laden) ہے۔

فہم دین /اسلامی تحریکیں

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

سامراجی نظاماتی تضادات

یوکرین میں سامراجی کشمکش

اسلامی تحریکوں کے لیے دروس وعبر

تحفظ اور غلبۂ دین کی اسلامی تحریکیں سامراجی سرمایہ دارانہ نظاماتی تناظر میں اپنی جدوجہد مرتب کرنے پر مجبور ہیں اس لیے سامراجی نظام کی نوعیت اور اس میں آتی ہوئی تبدیلیوں سے واقفیت ہمارے لیے ضروری ہے۔ آج یوکرین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سرمایہ دارانہ سامراجی تضادات کے اظہار کا ایک رخ ہے۔

بنیادی حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں سامراجی نظام یک قطبی (unipolar) ساخت سے کثیر القطبی (multipolar) ساخت کی طرف بتدریج مراجعت کر رہا ہے اور اس عملی مراجعت میں بہت سی ناہمواریاں واضح ہو رہی ہیں۔ کثیر القطبیت کا اظہار نظریاتی ہے نہ معاشرتی اور نہ معاشی۔ یہ اظہار صرف سیاسی ہے اور اس کی شکل سترھویں تا انیسویں صدی تک جاری رہنے والی سامراجی کشمکش کے مشابہ ہے۔

موجودہ سرمایہ دارانہ سامراجی کشمکش کے تین فریق ہیں: امریکا، چین اور روس۔ امریکا اپنی نظاماتی بالادستی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کر رہا ہے اور اس میں قدرے ناکام ہے۔ چین اپنے نظاماتی حلقہ اثر کو توسیع دینے کی جدوجہد کر رہا ہے اور روس اپنے کھوئے ہوئے نظاماتی حلقۂ اثر کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک دفاعی جنگ لڑ رہا ہے۔

اس سیاسی کشمکش کے باوجود یہ تینوں قطب عالمی سرمایہ دارانہ معاشی اور معاشرتی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہر فریق ہر دوسرے فریق سے وسیع پیمانے پر تجارتی اور سرمایہ کارانہ تعلقات رکھتا ہے۔ تینوں فریقوں کی معاشرت یکساں سیکولر ہے اور تینوں کا نظامِ ریاست جمہوری خطوط پر مرتب ہے۔ تینوں ممالک میں قوم پرستی کی وبا پھیل رہی ہے۔ یہ معاشرتی اور معاشی یکسانیت سیاسی کشمکش کو محدود رکھے ہوئے ہے اور یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان تینوں فریقوں میں براہ راست جنگ چھڑ جائے کیونکہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ تینوں قطب اپنی کشمکش کو

باجگزار ممالک تک محدود رکھنے پر مجبور ہیں۔

یوکرین میں امریکا کی شکست

یوکرین کا بحران عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ان تضادات کو واضح کرتا ہے۔ یوکرین کا حالیہ بحران اس وقت سے شروع ہوا جب بالٹک ریاستیں اور کچھ دیگر مشرقی یورپی باجگزار ممالک جو پہلے سوویت نظام سے منسلک تھے نیٹو اور یورپی یونین میں شامل کر لیے گئے۔ ۲۰۱۴ء میں امریکا نے یوکرین کی روس نواز حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اس وقت سے وہاں امریکا کٹھ پتلی حکومتیں قائم کیے ہوئے ہے مثلاً حالیہ صدر زیلنسکی ایک مسخرہ یہودی ہے جو یوکرین کو نیٹو اور یورپی یونین میں شامل کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔

نیٹو اور یورپی یونین کا پھیلاؤ روس اپنے سابقہ حلقۂ اثر کی تحدید کے مترادف سمجھتا ہے اور پیوٹن کی حکومت اپنی سابقہ ماتحت ریاستوں قازقستان، ازبکستان، بیلاروس اور یوکرین کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے ہر سیاسی قیمت دینے پر آمادہ ہے۔ اسی مقصد کے لیے یوکرین پر روس حملہ آور ہوا ہے۔ روس یوکرین کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا لیکن یوکرین کو امریکی تسلط میں دینے پر کبھی تیار نہیں ہوگا۔

امریکا نے یوکرین کی صرف سفارتی عالمی اعانت کی ہے۔ اس نے کسی یورپی ملک میں یوکرین کو روس کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی فوج نہیں بھیجی۔ فرانس اور جرمنی پیوٹن کی ایٹمی جنگ کی دھمکی سے بے حد خوف زدہ نظر آتے ہیں۔ یوکرین روسی سامراج کے لیے ایک نرم نوالہ اسی لیے ہے کہ میدان جنگ میں اس کے مفروضہ حلیف اس کو بالکل یکتا اور تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح چین اور امریکا نے پاکستان کو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

امریکا اور یورپی یونین نے روس پر جو معاشی پابندیاں لگائی ہیں وہ بھی بے اثر ثابت ہوں گی۔ روس کو عالمی مالیاتی نظام سے نہیں نکالا گیا، وہ System of Worldwide Financial Transactions (SWIFT) میں بدستور شامل رہے گا۔ صرف چند افراد اور بینکوں پر فنانشل پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور کچھ ٹیکنولوجیکل درآمدات کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ روس کی تیل، گیس اور اجناس (گیہوں) کی برآمدات پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ یورپی یونین اپنی گیس کی تقریباً ۴۰ فیصد اور تیل کی تقریباً ۲۷ فیصد درآمدات روس سے حاصل کرتا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں یورپی یونین روس کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر تھا۔ اس سال یورپی یونین کی مجموعی درآمدات میں روس کا حصہ تقریباً ۳۸ فیصد تھا۔ ان حالات میں جرمنی کا NORD Stream II کے منصوبہ کا تعطل بے نتیجہ نظر آتا ہے۔

مالیاتی پابندیاں ایک ناکارہ سامراجی ہتھیار ہیں۔ ان کے ذریعہ امریکا کہیں بھی اپنے مطلب کی سیاسی تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ نہ شمالی کوریا میں، نہ کیوبا میں، نہ وینزویلا میں، نہ ایران میں اور نہ نکاراگوا میں، نہ کہیں اور۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود سامراجی ملٹی نیشنلز، بینک اور فنانشل ادارے ان پابندیوں کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ سامراجی معاشی نظام بڑی حد تک سامراجی سیاسی تسلط کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی سب سے واضح مثال ان ٹیکنولوجیکل پابندیوں کی ناکامی ہے جو امریکا ۲۰۱۶، ۲۰۱۷ء سے آج تک چین پر نافذ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

امریکی کامیابی

لیکن یوکرین کی جنگ میں امریکا کو ایک بڑی کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ امریکی تخریب کار اداروں نے روسی جنگی منصوبہ کی تقریباً تمام تفصیلات معلوم کر لیں۔ وہ صدر پیوٹن کے خفیہ منصوبوں سے واقف ہو گئے اور انہوں نے روسی حملے کے وقت تک کا درست اندازہ لگا لیا۔ ان ایجنسیوں نے بڑے پیمانے پر روسی جنگی منصوبہ کی تشہیر کی اور اس کی وجہ سے یہ حملہ کسی کے لیے غیر متوقع نہ رہا۔ اسی وجہ سے مغربی سامراجی قوتوں میں اتحاد قائم ہوا اور انہوں نے مشترکہ پابندیوں کی تنفیذ بھی کی اور یوکرین سے ملحقہ ممالک میں نیٹو افواج بھی تعینات کیں اور امریکی بھگوڑوں کو یوکرین سے فرار ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔ اطلاعاتی جنگ میں امریکا سرخرو رہا ہے۔ یہ اطلاعاتی جنگ جاری ہے اور اس کے ذریعہ روسی سامراج کو پیچھے دھکیلنے کی امریکی ایجنسیاں مستقل منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔

اس اطلاعاتی جنگی کامیابی کے حصول کے لیے امریکی ایجنسیوں نے مندرجہ ذیل ہتھیاروں کو استعمال کیا:

۱۔روس اور یوکرین میں امریکی، یورپی اور مقامی تخریب کار

۲۔یوکرین میں مقیم ملٹی نیشنل کمپنیاں اور مالیاتی ادارے

۳۔روسی مواصلاتی نظام میں آئی ٹی ٹیکنالوجی کے ذریعے دراندازی

۴۔روسی سوشل میڈیا

۵۔کرپٹالوجی(Cryptology)اورالیکٹرانک (Electronic Intercept) ٹیکنالوجی

۶۔کمیونی کیشن نیٹ ورک یعنی انٹرنیٹ سرور اور پلیٹ فارمز اور سٹیلائٹ کمیونی کیشن

جولائی 2021ء سے بلکہ اس سے بھی قبل امریکی ایجنسیاں روسی فوج کی کڑی نگرانی کرنے لگیں اور روسی فوجی کمانڈروں کے دماغوں میں روسی عسکری منصوبہ بندی کے ضمن میں شکوک و شبہات فروغ دینے میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے جنوری 2022ء میں روسی حکومت کے سامنے اس کی جنگی منصوبہ بندی کی تفصیلات طشت ازبام کردیں۔

یوکرین کے خلاف امریکا اور روس ایک ہائبرڈ جنگ لڑ رہے ہیں اور دونوں سامراجی قطب اس جنگ میں اطلاعاتی تخریب کاری کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چونکہ روس اور امریکا دونوں جمہوری ممالک ہیں لہٰذا اس اطلاعاتی جنگ کا ایک بڑا مقصد رائے عامہ کو متاثر کرنا بھی ہے۔ امریکا کی ایک بڑی کامیابی یہ بھی ہے کہ اس اطلاعاتی جنگ کے نتیجہ میں روس کے کئی شہروں میں یوکرین پر حملہ کے خلاف عوامی مظاہرے منعقد ہو رہے ہیں اور امریکا روس میں جاری اس قسم کی عوامی مزاحمت سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسباق

اس تجزیہ میں ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ تحفظ اور غلبۂ دین کی اسلامی تحریکوں کا دورِ حاضر میں اصل مقابلہ سامراج سے ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مسلم دنیا میں دو قسم کی حکومتیں پائی جاتی ہیں: ایک وہ جو سامراج سے نجات حاصل کرنے کی جوجدوجہد کر رہی ہیں مثلاً افغانستان، ایران، مصر اور دوسری وہ جو سامراج کی باجگزار ہیں مثلاً سعودی

عرب، پاکستان، قازقستان، ملائشیا وغیرہ۔

ہمیں سامراج مخالف حکومتوں کا حمایتی اور طرف دار ہونا چاہیے۔ یہ حکومتیں بھی سرمایہ دارانہ نظاماتی غلبہ کے تناظر میں کام کر رہی ہیں اور بہت سی ایسی پالیسیاں اپنانے پر مجبور ہیں جو اسلامی معیارات پر پوری نہیں اترتیں۔ یہ اسلامی سلطنتیں ہیں خلافت راشدہ نہیں۔ ان کے خلاف خروج یا کسی قسم کا اجتماعی احتجاج جائز نہیں۔ ان کے خلاف مزاحمت سامراج کے ہاتھوں میں کھیلنا ہے۔ امام مرسی رحمہ اللہ کی حکومت کو ختم کرنے میں کئی اسلامی گروہ بھی شامل تھے اور انہوں نے سیسی جیسے دہریہ اور سامراجی آلہ کار کے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ آج طالبان کے خلاف یہی حماقت داعش کر رہی ہے اور اس سے فائدہ صرف سامراج کو ہو رہا ہے۔ ہمیں ان اسلامی سلطنتوں کی مجبوریوں کا احساس کرتے ہوئے ان کی ہم نوائی اور حمایت کرتے رہنا چاہیے۔

مسلم دنیا میں قائم سامراج باجگزار ریاستیں کسی معنی میں بھی اسلامی ریاستیں نہیں۔ یہ سب دہریہ ریاستیں ہیں۔ ان میں نہ شرع نافذ ہے نہ اجتماعی فیصلے علوم اسلامی کی روشنی میں مرتب کیے جاتے ہیں۔ یہاں اسلامی انقلابی جدوجہد کا جاری رہنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری بھی ہے۔ جن مسلم اکثریتی ممالک میں دہریہ سامراجی کاسہ لیسوں کو ریاستی اقتدار حاصل ہے ان میں تحریکات تحفظ اور غلبہ دین کی جدوجہد ان خطوط پر مرتب ہونی چاہیے کیونکہ سرمایہ دارانہ سامراج ایک ایسی نظاماتی قوت ہے جو ریاست اور معاشرہ کی ہر سطح پر دراندازہونے کی جستجو کرتی ہے لہٰذا ہر اسلامی گروہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبہ (تعلیم، تزکیہ، رفاہ عامہ، سیاسی) میں سامراج کے نفوذ کی حکمت عملی سے واقف ہو۔ اس شعبہ میں کیے جانے والے سامراجی اقدام کو پہچانے اور ان کو ناکام بنانے کے لیے اسلامی حکمت عملی مرتب کرے۔

تمام اسلامی گروہ متحد ہو کر ان مختلف النوع حکمت عملیوں کو ایک جامع نظاماتی حکمت عملی میں مربوط کریں اور اس حکمت عملی کے تنفیذی عمل کی مستقل جانچ پڑتال کرنے کا انتظام کریں۔

حکومت، ریاست کا محض ایک نسبتاً غیر اہم شعبہ ہے۔ ریاست کے دوسرے شعبے فوج، پولیس، انتظامیہ، عدلیہ، کارپوریشن اور میڈیا ہیں۔ پاکستان میں سامراج ہر شعبہ میں اپنے گھس بیٹھیے داخل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ان گھس بیٹھیوں کی کارفرمائی کی نشان دہی تحریکات اسلامی کو کرتے رہنا چاہیے اور اس کے لیے سرمایہ دارانہ مخالف اطلاعاتی نظام کو مرتب کرنے کی

ضرورت ہے۔

ہم نے دیکھا کہ روس کی یوکرین کی مہم کے خلاف امریکی اطلاعاتی تخریب کاری نہایت کامیاب رہی۔اس کے برعکس افغانستان میں یہ نظام بری طرح ناکام ہوا تھا۔اور آج عراق میں بھی ناکام ہورہا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افغانستان میں (اور عراق میں آج) ایک روایتی عوامی جنگ لڑی گئی جس کا انحصار قدیم مواصلات پر زیادہ اور الیکٹرانک مواصلات پر نہایت محدود تھا (اور ہے)۔سامراجی مواصلاتی تخریب کاری کو ناکام بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مواصلاتی نظام کی مرکزیت روایتی گروہ بندیوں (محلے، مساجد، بازار، قبائل، جرگوں) میں قائم کریں اور الیکٹرانک اطلاعاتی نظام کا استعمال نہایت احتیاط سے اور محدود پیمانے پر ہونا چاہیے۔ سامراج کو شکست عموماً عوامی جنگ میں دی جاتی ہے۔غریب مما لک کی فوجیں سامراج کو شکست دینے کی استطاعت نہیں رکھتیں اور سامراج انہی فوجوں سے لڑنا چاہتا ہے جن کو وہ شکست دے سکے۔امریکا سے زیادہ بزدل اور سفاک قوم تو تاریخ انسانی میں کوئی نہیں پائی جاتی۔

سامراج گزار ریاستوں میں وہ حلقے بھی شریک ہوتے ہیں جو ایک سامراجی قطب (امریکا) کے مقابلے میں دوسرے سامراجی قطب (چین) کا سہارا لینے پر اصرار کرتے ہیں اور سامراجی قوتوں کا یہ تصادم سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کو کمزور کرتا رہتا ہے۔اسلامی تحریکوں کو ان فریقوں میں سے کسی کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چین بھی ایک سرمایہ دارانہ سامراجی ملک ہے جو مشرقی ترکستان پر قبضہ کیے ہوئے بیٹھا ہے اور مسلمانوں (بشمول چینی مسلمانوں پر) ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔آج چینی سامراج بڑے پیمانے پر پاکستان میں داخل ہو چکا ہے اور چینی سامراج پاکستان کی ملکی سالمیت کے لیے اتنا ہی بڑا خطرہ ہے جتنا امریکا۔

سامراجی باجگزار ریاستی اداروں میں (بالخصوص فوج میں) ایسے افراد اور گروہ بھی شامل ہیں جو ملکی خود انحصاریت پر یقین رکھتے ہیں اور سامراج نواز پالیسیوں کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔لیکن ان کا تصور قومی مفاد سرمایہ دارانہ ہی ہوتا ہے (مثلاً سوئیکارنو، صدام حسین)۔وہ سمجھتے ہیں کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ اپنے ملک کو ایک خود کفیل، طاقتور سرمایہ دارانہ ملک بنادیں۔وہ نظریاتی قوم پرست ہوتے ہیں اور اسی لیے عالمی سامراج انہیں کسی نہ کسی حد تک برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہمیں ان سامراج مخالف حلقوں سے روابط قائم کرنے چاہئیں اور انہیں باور کرانا چاہیے کہ قومی مفاد کا یہ تصور لغو ہے۔ سرمایہ داری ایک عالمی نظاماتی کلیت ہے جس میں ملکی خود انحصاریت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آج کوئی بھی خود انحصاری نہیں۔ نہ امریکا، نہ روس، نہ چین، نہ جاپان، نہ جرمنی، نہ جنوبی کوریا اور نہ ویت نام۔ صرف وہ ممالک خود انحصاری ہیں جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے قدرے لاتعلق ہیں۔ شمالی کوریا، کیوبا، وینزویلا، ایران اور چونکہ ایران کے سوا ان ممالک کی نظریاتی اساس بھی سرمایہ دارانہ ہے (قوم پرست اشتراکیت) لہٰذا غالب امکان یہی ہے کہ کوئی نہ کوئی سرمایہ دارانہ قطب انہیں اپنے زیرنگیں کرلے گا۔

خود انحصاریت کے فروغ کا مطلب ہے سرمایہ دارانہ عالمی نظام سے مراجعت۔ پاکستان کا قومی مفاد سرمایہ دارانہ ترقی کے حصول میں نہیں بلکہ حصول رضائے الٰہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پاکستانی آخرت میں جنت کے حقدار قرار دیے جائیں۔ الحمدللہ پاکستان کے ریاستی سامراج مخالف حلقوں میں مذہبی عصبیت موجود ہے۔ اسلامی تحریکوں کی ذمہ داری ہے کہ ان حلقوں کے تصور قومی مفاد کی اصلاح کریں اور ان کو باور کرائیں کہ پاکستان کا مستقبل سرمایہ دارانہ نظاماتی انضمام میں نہیں بلکہ اس سے انخلا اور اسلامی طرز زندگی اور نظامِ حیات کی تعمیر میں ہے تاکہ ہمارا ملک بھی ایک اسلامی سلطنت بن جائے۔

قارئین کے لیے

یہ ہمارے لیے اعزاز ہے کہ ملک کے معروف دانشور ڈاکٹر ایس ایم زمان (اسلام آباد)، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری (کراچی) اور سید وقاص جعفری (لاہور) ہر سال باقاعدگی سے البرہان کا سالانہ زرتعاون ادا کرتے ہیں۔ البرہان کے دیگر قارئین سے بھی درخواست ہے کہ البرہان کا سالانہ زراعانت مبلغ -/800 روپے بھجوا کر شکریہ کا موقع دیں۔ بذریعہ چیک، منی آرڈر، موبی کیش (محسن یوسف:0306-4640366)۔

سرکولیشن انچارج

اسلام اور تجدد مدیر

احمد جاوید صاحب اور مدحتِ غامدی

اسلام اور تجدد کے اس گوشے میں اس ماہ جناب احمد جاوید صاحب کے غامدی صاحب کی مدح کے ردِّعمل میں لکھے گئے بعض اہل علم کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔مقصود آنجناب کی مخالفت نہیں بلکہ انہیں اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ غامدی صاحب جیسے متجدد کی مدح اوران کی فکر کی بالواسطہ حمایت جمہور علماء اور اہل علم کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔

چند سال پیشتر ملی مجلس شرعی، جو سارے دینی مکاتب فکر کے معتدل مزاج ثقہ علماء کا علمی پلیٹ فارم ہے، اس پر غامدی صاحب کی فکر زیر بحث آئی۔بعض دینی مدارس کے دارالافتاء خصوصاً معتدل مزاج جامعہ اشرفیہ کے دارالافتاء کا فیصلہ جس میں غامدی صاحب کی تکفیر کی گئی تھی، بھی زیر بحث آیا۔مجلس کے علماء کرام نے بحث ومناقشہ کے بعد جاوید غامدی صاحب کے افکار ونظریات کو گمراہی پر مبنی قرار دیا۔ اس مجلس میں حنفی دیوبندی مکتب فکری کے علماء میں سے مولانا زاہد الراشدی، مولانا فضل الرحیم (جامعہ اشرفیہ)، مولانا عبدالروٴف فاروقی (جمعیت علماء اسلام س)، مولانا غضنفر عزیز (جمعیت علماء اسلام ف)، حنفی بریلوی مسلک کے مولانا مفتی محمد خاں قادریؒ، مولانا احمد علی قصوریؒ اور علامہ خلیل الرحمن قادریؒ شامل تھے جبکہ اہل حدیث علماء میں سے مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی اور قاری محمد یعقوب شیخ (جماعۃ الدعوۃ) شامل تھے۔ جماعت اسلامی کے مولانا عبدالمالک، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، تنظیم اسلامی کے امیر حافظ عاکف سعید اور اہل تشیع کے علامہ نیاز حسین نقوی مرحوم (جامعہ المنتظر) بھی شامل تھے۔ان کے علاوہ جسٹس (ر) نذیر احمد غازی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد امین بھی اجلاس میں شریک تھے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔

حنفی مسلک کے مولانا احسن خدامی، (مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بھتیجے) نے اپنے ماہانہ رسالہ 'صفدر' کے دو ضخیم غامدی نمبر شائع کیے جن میں حنفی مکتب فکر کے بہت سے دینی مدارس کے دارالافتاء اور پاکستان بھر کے کبار حنفی علماء کی آراء جمع کی گئی ہیں جن میں غامدی صاحب کی

یا توتکفیر کی گئی ہے یا انہیں گمراہ قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح حنفی مسلک کے مولانا مفتی عبدالواحدؒ، اہل حدیث حضرات میں سے ڈاکٹر محمد زبیر اور جامعہ نعیمیہ کے فارغ التحصیل مولانا محمد رفیق نے غامدی صاحب کی فکر کو فتنہ انگیز اور گمراہ کن قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف کئی کتابیں لکھی ہیں۔

مطلب یہ کہ ایسا شخص جس کی گمراہی پر پاکستان کے سارے دینی مکاتب فکر کے معتدل مزاج اور ثقہ علماء متفق ہیں اور دیگر اہل علم بھی ان کے تجدد کی بناء پر ان کے نظریات کو ناپسند کرتے ہیں، ایسے شخص کی مدح اور اس کی بالواسطہ حمایت جناب احمد جاوید صاحب کے شایانِ شان نہیں۔

بقیہ: غامدی صاحب۔علمیت اور حسنِ اخلاق؟

غامدی صاحب کی عربی میں مہارت کی ایک اور مثال یہ ہے کہ 'میزان' ۲۰۰۲ء میں ص ۲۵ سے ۳۳ تک قراءات متواترہ پر بحث کی گئی ہے اور قراءت کا لفظ وہ اپنی اس بحث میں ۳۴ دفعہ لے کر آئے ہیں اور ہر دفعہ انہوں نے اس لفظ کو قرات ہی لکھا ہے انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ لفظ قرات نہیں قراءت ہوتا ہے جس کی جمع قراءات ہے۔ ہمارے دوست زبیر صدیقی کی تنقید کے بعد ۲۰۰۸ء کے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی گئی۔

امام ابن سیرین نے فرمایا تھا کہ جب تم کسی سے دین لو تو دیکھو کہ کس سے دین لے رہے ہو؟ مطلب یہ کہ علوم قرآن وسنت میں اس کی مہارت اور اس کے کردار واخلاق کو دیکھو۔تو ہم نے جناب غامدی صاحب کی علمیت، عربی دانی اور اخلاق وکردار کی جو چند مثالیں سطور بالا میں پیش کی ہیں، اس کے بعد ہر جہاں دیدہ مسلمان بآسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایسے شخص سے دین لینا چاہیے یا نہیں؟

جہاں تک ان کی فکر کا تعلق ہے تو وہ انتہائی قابل اعتراض ہے جس پر ہماری تنقید معروف ومشہور ہے۔

اسلام اور تجدد

ڈاکٹر مشتاق احمد[1]

احمد جاوید صاحب کی طرف سے غامدی صاحب کی حمایت کیوں اور کیسے؟

احمد جاوید صاحب کی گفتگو سن کر سمجھ میں یہی آیا کہ وہ جاوید احمد غامدی صاحب کی فکر اور ان کے دینی تصور کو غلط سمجھتے ہوئے ان کے بارے میں حسنِ ظن کی بنیاد پر ان کو ایسا الاؤنس دینا چاہتے ہیں جس کی نہ غامدی صاحب کو طلب ہے، نہ ہی ان کو اس کا کچھ فائدہ ہے۔

اگر ان کی گفتگو صرف اس پہلو تک محدود رہتی کہ غامدی صاحب کے تصورِ دین سے علمی اور اصولی اختلاف کے باوجود وہ ان کے شخصی محاسن کے قائل ہیں، تو شاید میں اس گفتگو پر تبصرے کی ضرورت محسوس نہ کرتا (اگرچہ مجھے ان کے بیان کردہ غامدی صاحب کے شخصی محاسن کی فہرست میں "تحمل" کو بھی شامل کرنے پر کچھ تحفظات ضرور ہیں)۔ اسی طرح اگر وہ صرف اس نصیحت تک محدود رہتے کہ غامدی صاحب کے ناقدین ان کے متعلق بات کرتے ہوئے نازیبا کلمات یا نامناسب تعبیرات استعمال نہ کریں، تو پھر بھی میں اس گفتگو کو نظرانداز کردیتا (اگرچہ میری خواہش یہ ہوتی کہ یہی نصیحت غامدی صاحب کے قریبی حلقے کے لوگوں اور ان کے مصاحبین، بالخصوص ان کے دامادِ عزیز، کو بھی کہنے کی ضرورت ہے جو کبھی کبھار اسلامی فقہ اور فقہائے کرام کے متعلق استہزا کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور واہ واہ سمیٹتے ہیں)۔ تاہم جب اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے غامدی صاحب کے لیے عذرخواہی کی کوشش بھی کی تو احقاقِ حق کی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے چند نکات پیش کرنا ضروری ہوگیا ہے۔

احمد جاوید صاحب کا خیال یہ ہے کہ غامدی صاحب زندگی پر دین کی حاکمیت کے قائل ہیں اور وہ مسائل اور امور کو دین کے نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ بات کہتے ہوئے احمد جاوید صاحب کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ غامدی صاحب کے قریبی حلقے کے لوگوں میں ہی ایسے افراد ہیں جو برسہابرس سے ان سے اکتسابِ فیض کررہے ہیں اور وہ غامدی صاحب کے تصورِ دین اور تصورِ جہاں سے 'مذہبی سیکولرزم' جیسا oxymoron کشید کرنے

[1] ڈین سوشل سائنسز، قرطبہ یونیورسٹی پشاور

کی کوشش کررہے ہیں۔ بلکہ ان کا خیال اس پہلو کی طرف بھی نہیں گیا جس پر خود انھوں نے اسی نشست میں تنقید فرمائی ہے کہ غامدی صاحب نے دین کا تصور بہت زیادہ محدود کردیا ہے۔ اب یہ تصور جس وجہ سے بھی محدود کیا ہو، اس کے پیچھے جو بھی مصلحت یا حکمت ہو (یا بے شک یہ ردّعمل کی نفسیات سے پھوٹا ہو)، سوال یہ ہے کہ اس محدود تصورِ دین کے ساتھ دین کی حاکمیت کا مطلب کیا ہوا؟

غامدی صاحب کے لیے عذر خواہی میں احمد جاوید صاحب نے یہ دلیل دینے کی کوشش کی ہے کہ دین کا محدود تصور وہ مصلحتاً پیش کررہے ہیں۔ کیا اس طرح وہ غامدی صاحب کی تحسین کررہے ہیں یا تنقیص؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بلکہ میری سمجھ میں تو یہ بات بھی نہیں آئی کہ اس تحسین نما تنقیص یا تنقیص نما تحسین کو غامدی صاحب کے مصاحبین کیوں لے اڑے ہیں؟ کیا اس بات کا مفہوم ان کی سمجھ میں بھی نہیں آسکا؟ احمد جاوید صاحب نے اس مقام پر تقریظ اور تنقید میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ دین کے متعلق غامدی صاحب کے اس مبنی بر مصلحت اظہاریے سے خود دین کے لیے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں، اور یہ حصہ سنتے ہوئے میرے ذہن میں بے ساختہ پشتو ترکیب "درہ وال ٹوپک" آگئی، یعنی درہ آدم خیل میں بنائی جانے والی بندوق جس کا بھروسا نہیں ہوتا کہ کب وہ سامنے کی بجائے پیچھے فائر کرکے خود بندوق بردار کو ہی نقصان پہنچادے۔

میرے لیے سب سے زیادہ حیران کن امر یہ ہے کہ احمد جاوید صاحب کے مطابق غامدی صاحب کا تصورِ دین صرف ان چند امور تک محدود ہے جن میں کسی ایک کا بھی انکار کفر کہلاتا ہے۔ کیا احمد جاوید صاحب بھول گئے ہیں کہ غامدی صاحب اپنے فکری ارتقا (یا شاعرانہ انفعال) کے نتیجے میں پچھلے کچھ عرصے سے اس کے قائل ہوگئے ہیں کہ کسی بھی شخص کی، جو خود کو مسلمان کہتا ہے، تکفیر نہیں کی جاسکتی؟ کاہے کا کفر، حضور؟ جب کسی شخص کو، جو خود کو مسلمان کہتا ہے، کسی بھی دعوے کے اثبات یا انکار پر، کافر کہا نہیں جاسکتا، تو پھر وہ مصلحت ہی کہاں باقی رہی جس کی وجہ سے دین کا محدود تصور پیش کیا جارہا تھا؟

اس مصلحت یا حکمتِ عملی پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جو احمد جاوید صاحب کے خیال میں غامدی صاحب کے تصورِ دین کو محدود کرنے کا باعث بن گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "زیادہ لوگوں کا دفاع ایک آدمی نہیں کرسکتا!" سوال یہ ہے کہ جو کام ایک آدمی نہیں کرسکتا، وہ اس نے اپنے ذمہ لیا ہی کیوں

ہے؟ کیا اپنی کمزوری کی بنا پر دین کے تصور کو محدود کر دینے کی بجائے زیادہ بہتر یہ نہ ہوتا کہ دین کے صرف اسی حصے کے دفاع یا توضیح تک خود کو محدود کیا جاتا جس کا دفاع یا توضیح وہ کر سکتے تھے؟ آخر کیوں انھوں نے اپنے اوپر یہ لازم کیا ہے کہ کلام، اصول، فقہ، تفسیر، حدیث، سیرت، تاریخ وغیرہ، ہر ہر شعبے میں ترک تازیاں کرتے رہیں اور کسی ایک سوال کے جواب میں بھی کبھی یہ نہ کہیں کہ وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے کیونکہ انھوں نے اس پر مطالعہ نہیں کیا ہے؟

احمد جاوید صاحب کی گفتگو کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جہاں وہ غامدی صاحب کے ان متبعین کا ذکر کرتے ہیں جو بقولِ ان کے، "ان کا کندھا استعمال کر رہے ہیں"۔ احمد جاوید صاحب کا مشورہ ہے کہ "ان سے نہ جانچیں انھیں"۔ ان لوگوں کی نفسیات کی بڑی خوب صورت تعبیر احمد جاوید صاحب نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: "دین سے آزادی، بے دینی کے خطرے میں ڈالے بغیر"۔

اب بہت سارے واقعات یاد آگئے ہیں لیکن ایک کا ذکر مناسب ہوگا۔ 2000ء اور 2001ء میں جب بھی غامدی صاحب کا اسلام آباد آنا ہوا، مَیں اپنے دوستوں سمیت ان کی مجلس میں پہنچ کر ان سے استفادے کی کوشش کرتا۔ تاہم ہر ایسی مجلس میں ہوتا یہ تھا کہ ان کا درسِ قرآن تو بہت اچھا لگتا تھا لیکن درسِ قرآن کے بعد غیر سنجیدہ (بعض اوقات انتہائی فضول) سوالات سے سخت کوفت ہوتی۔ مثلاً ایک دفعہ غامدی صاحب نے سورۃ المآئدۃ کی ان آیات کا درس دیا جن میں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ مذکور ہے۔ غامدی صاحب نے ان آیات سے تذکیر بہت اچھے انداز میں کی لیکن ان کے درس کے خاتمے پر پہلا سوال تھا: نیل پالش کے ساتھ وضو ہو سکتا ہے یا نہیں؟! میں نے غامدی صاحب کو ایک خط میں یہ تجویز پیش کی کہ درس کے بعد درس سے متعلق سوالات ہوں، تو زیادہ بہتر ہوگا، بے شک بعد میں متفرق سوالات بھی ہوتے رہیں۔ انھوں نے جواب میں وعدہ کیا کہ وہ منتظمین کی توجہ اس طرف دلائیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب کو خود یہ احساس کیوں نہیں ہو رہا کہ ان کا کندھا کون اور کس مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ بلکہ اس سے زیادہ سنجیدہ سوال یہ ہے کہ بعض اوقات خود غامدی صاحب ایسے کاموں کے لیے اپنا کندھا کیوں آگے کر دیتے ہیں؟ احمد جاوید صاحب فرماتے ہیں کہ غامدی صاحب کو اپنے ایسے پیروکاروں سے نہ جانچیں لیکن خود غامدی صاحب نے اپنی تحریرات میں بھی بعض مقامات پر، اور زبانی گفتگو میں تو بارہا، سیدنا مسیح علیہ السلام کا یہ قول اپنی تصویب کے ساتھ پیش کیا ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے!

اسلام اور تجدد

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن[۱]

احمد جاوید صاحب کی غامدی صاحب کی مدح محض 'ادبی مبالغہ' اور 'لسانی تجلیل' ہے

جاویدین جاودان

اگلے روز غامدی صاحب پر جاوید بھائی کی گفتگو سنی تو چنداں حیرت نہ ہوئی کیونکہ میں جاوید بھائی کے مزاج اور طریق کار سے، موجودہ فیس بکی دنیا کے اکثر چرند پرند، اور بعض درند کی نسبت بھی زیادہ (طویل عرصے سے) واقف ہوں۔

بات یہ ہے کہ احمد جاوید اور جاوید احمد غامدی قطبین کے تضاد والا مزاج رکھتے ہیں

دینی روایت کے معاملے میں غامدی صاحب جہاں انفرادیت، تفرد اور ایک نک چڑھے نبوغ کو اس درجے کا کمال، خوبی اور وصف سمجھتے ہیں کہ اس تفرد و نبوغ کو پال پوس کر تر کی دنبہ بنانے کے لیے انہیں اگر پوری امت کی روایت کو ذبح کرنا پڑے تو نہ صرف یہ کہ وہ یہ کر گزرتے ہیں بلکہ اس میں بسا اوقات وہ خود بھی (اور ان کے معتقدین تو اکثر ہی) لذت کشید کیا کرتے ہیں! (یاد کیجیے 'میزان' والی گفتگوؤں میں اساطینِ امت کے بارے میں ان کا معروف تضحیکی جملہ: 'آؤ ذرا غیبت غیبت کھیلیں')

لیکن احمد جاوید اس معاملے میں بے حد محتاط ہیں۔ وہ امت کے تسلسل اور تواتر سے ہٹ کر کی گئی دین کی کسی تعبیر کے قائل نہیں ہو سکتے۔ متواتر فہم امت سے الگ راہ نکالنے کو وہ خطرۂ ایمان سمجھتے ہیں (لیکن خطرۂ ایمان والوں کے لیے خطرۂ جان بن جانے والے رویوں کو بھی وہ کبھی پسند نہیں کرتے) اس بارے میں اگر ان کا حقیقی نقطہ نظر جاننا ہو تو قاری ایوب دہلوی پر ان کی گفتگو کا ابتدائی حصہ اور مفتی محمد شفیع والی گفتگو پوری سننا چاہیے۔

اس کے برعکس غامدی صاحب کے فہمِ دین، اور اس سے نکلنے والی آزادروی کی گنجائش کے مذہبی متوالوں اور سیکولر ڈگڈگی کے نچیوں، کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انہیں سب سے زیادہ چڑ ہی امت کے تواتر، تسلسل اور اجماع کے تصور سے ہے۔ 'اجماعِ امت' کا لفظ سنتے

---

[۱] سربراہ شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ہی وہ آسیب کے اثر میں آئے ہوئے معمول کی طرح چنگھاڑنے لگتے ہیں۔

جاوید بھائی کا معاملہ یہ ہے کہ مختلف افکار وخیالات اور خصوصاً شخصیات (ماضی قریب کی یا وہ جو زندہ ہیں) کے حوالے سے انہیں اظہار خیال کرنے کی ضرورت محسوس ہو یا کوئی مجبوری آن پڑے تو ان کے ہاں عموماً تین طرح کے رویے ہوتے ہیں:

۱۔ زیر بحث مسئلہ موضوع یا شخصیت کے ذوق، مزاج، فکر یا ادبی حسیت وغیرہ سے اگر انہیں احساساتی ہم آہنگی، فکری اتفاق اور طبعی مناسبت ہو تو وہ ان کی شخصی یا/اور فکری وفنی تعریف حد درجہ شدت، شکوہ، بلند آہنگی اور نہایت تجلیل کے ساتھ تفضیلی صیغوں (superlatives) کا استعمال کیا کرتے ہیں [مثلاً علما میں قاری ایوب دہلوی، مفتی محمد شفیع اور شعرا میں سلیم الرحمن، ظفر اقبال]۔

۲۔ جن سے انہیں جزوی اتفاق ہو، بشرطیکہ وہ ان کا اپنا کوئی ہو، یا ان کے قبیلے و جرگے کا ہو، تو جاوید صاحب اس کے لئے حسبِ موقع و ضرورت کچھ ضروری نیک کلمات تو ادا کرتے ہیں مگر اس کے فکر و خیال کے (اپنے تئیں) ضرر رساں پہلوؤں کی شدت کے ساتھ تنقید، تعریض اور تنقیص تک بھی کرتے ہیں۔ [مثلاً محمد حسن عسکری] بالکل ایسے ہی جیسے ایک ہمدرد باپ اور محبت کرنے والا بھائی محلے کے کسی لونڈے لپاڑے کی غلط روش پر تو خاموش رہ جاتا ہے مگر اپنے بیٹے میں بدتمیزی اور غلط کاری کسی صورت برداشت نہیں کرتا، بلکہ تنبیہہ، سرزنش اور تادیب تک کرتا ہے۔

۳۔ جن کے ذوق وفکر اور خیالات سے انہیں بالکل اتفاق نہیں ہوتا یا کلی اختلاف ہوتا ہے (اور اگر وہ ان کے اپنے جرگے یا قبیلے سے باہر کا کوئی شخص از قسم ملحد، لبرل یا سیکولرائزڈ مذہبی آدمی بھی ہو) تو تالیفِ قلب کی حکمت کے پیش نظر جاوید صاحب ایسے لوگوں کے فکر و خیال کے مضر یا اختلافی پہلوؤں کی طرف چلتے ہوئے ہلکے پھلکے، سرسری اور اجمالی اشارے سے کر کے جلدی سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور پھر اپنی طلاقت لسانی کا سارا زور ان کے کردار، اخلاق، مزاج یا ظواہر کی خوبیاں اجاگر کرنے میں صَرف کرتے ہیں اور مبالغے کے حد درجہ صیغے میں ان کی تعریف و توصیف اور ستائش و تحسین کر کے تمت بالخیر کر دیتے ہیں۔ [مثلاً وجاہت مسعود وغیرہ]

اس مؤخر الذکر صورت کو میں اپنے تسلئ فہم و دل کے لیے جاوید بھائی کا مخصوص "طریقۂ

واردات" کہتا ہوں جس سے وہ کبھی بر بنائے مصلحت اختیار کرتے ہیں کبھی ازراہِ دلجوئی اور کبھی محض نیک گمانی کے طور پر!

ہمارے وہ دوست جنہیں ان کی ایسی باتوں پر حیرت ہوتی ہے انہیں یہ خطرہ بہرصورت پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ عین ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے جاوید بھائی کسی آئندہ موقع پر ترازو کے جھکے ہوئے پلڑے کو توازن میں لاکر اٹھے ہوئے کم وزن پلڑے کا حساب بے باک کرنے کی تیاری کے طور پر کر رہے ہوں۔

جاوید بھائی کے ان رویوں میں اگر مبالغہ آرائی کی کوئی رمک محسوس ہو تو یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ یہ کوئی قانونی، اخلاقی اور فقہی معنوں میں مبالغہ نہیں ہوتا جو کہ واقعی عیب کی بات ہے بلکہ یہ ایک خطیبانہ و شاعرانہ انداز کا مبالغہ ہوتا ہے۔ شعری مبالغے کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کا ذوق محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی وغیرہما کے شعری نظریات کے زیر اثر بالکل ہی سرطانی نہ ہو گیا ہو تو وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ یہ ایک نہایت خوبی کی بات ہے۔ کلام میں شدت، شان، شکوہ، جلال، عمق، تجلیل و تمجید اور اثر انگیزی پیدا کرنے کے جملہ وسائل ولوازمات، جو شعری لسانیات نے پیدا کئے ہیں، مبالغہ ان میں سب سے مؤثر وسیلۂ تاثیر اور ذریعۂ بلاغت ہے۔ بات میں زور اور تاکید پیدا کرنے کے خطیبانہ و شاعرانہ وسیلے کے طور لیے صنعتِ مبالغہ کو اگر فنکارانہ جمالیات کیساتھ کام میں لایا جائے تو ملکی معیشت کی طرح یہ صنعت، کلام کی سطح بھی بلند اور مستحکم اور کر دینے کی پوری طرح اہل ہے۔

المختصر جاوید بھائی کسی بھی مسئلے، بطور خاص معاصر شخصیات، پر رائے دیتے ہوئے خیر خواہی اور حسنِ ظن کی آخری حد پر رہتے ہوئے کلام کرنے کی روش قائم رکھا کرتے ہیں۔ اپنے مجلسی مخاطبوں میں وثوق، تاکید اور اثر انگیزی پیدا کرنے کے لیے شدت، شان، شکوہ، جلال، عمق اور تجلیل و تمجید کے صیغے استعمال کرنا ان کا وسیلہ ہوتا ہے مقصود نہیں۔

بات چونکہ غامدی صاحب کے بارے جاوید بھائی کی رائے سے شروع ہوئی تھی اس لیے عرض ہے کہ غامدی صاحب کے بارے میں جاوید بھائی نے تیسرا یعنی دلجوئی، احتیاط اور خیر خواہی والا طور اختیار کیا ہے ورنہ میرے خیال میں غامدی صاحب کے بارے میں آخری تجزیے میں ان کا حتمی موقف وہی ہے جس کا اظہار چار پانچ سال پہل انہوں نے ایک نجی محفل میں کچھ احباب

کے سامنے کسی اور کا خیال مستعار لے کر یوں کیا تھا:

'حسرت موہانی کو دیکھ کے لگتا ہے کہ وہ مسلمان پہلے ہیں اور لبرل بعد میں جبکہ غامدی صاحب کے معاملے میں یہ نسبت الٹ جاتی ہے۔'

یہ میں کوئی سخن سازی نہیں کر رہا بلکہ یہ سب ۲۰۱۷ءہمیں انہی کے حوالے سے فیس بک پہ لکھ بھی چکا ہوں اور اس پر محترم اجمل کمال سے ایک مچیٹا بھی ہوا تھا کیونکہ انہوں نے بغیر کسی جواز/وجہ کے جاوید بھائی کے لیے کچھ بے توقیری کے کلمات ادا کئے تھے۔

جاوید بھائی کی غامدی صاحب پر گفتگو سنتے ہوئے یہ مصرع میرے دماغ میں گونجتا رہا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

لیکن جب اس پر جناب ڈاکٹر مشتاق احمد کا تبصرہ پڑھا تو بار بار اگلا مصرع یاد آتا رہا۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وما علینا الا البلاغ المبین

متجددین کی سوچ کا انداز

آج سے کچھ سال پہلے جاوید غامدی صاحب کے شاگرد عمار ناصر صاحب کی ایک تحریر سامنے آئی کہ بیت المقدس پر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کا حق فائق ہے(کیونکہ مغرب کی یہی رائے تھی)۔پھر جب پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت ،بہت بڑی اکثریت،ممتاز قادری شہیدؒکی پھانسی کی مخالفت کر رہی تھی،عمار ناصر صاحب بعض حنفی فقہاء کی اقلیتی رائے کی دھول اڑا رہے تھے کہ اسے ملعون شاتم رسول کو قتل نہیں کرنا چاہیے تھا(کیونکہ مغرب قانون توہین رسالت کے خلاف ہے)۔اور آج کل عمار ناصر صاحب متفکر ہیں کہ قادیانیوں کو ان کے حقوق نہیں دیے جا رہے ۔(کیونکہ مغرب قادیانیت کی حمایت کرتا ہے)۔نتیجہ قارئین خود اخذ کر لیں۔

اسلام اور تجدد　　پروفیسر رحیم بخش

احمد جاوید صاحب کی طرف سے

غامدی صاحب کی حمایت کا نرالا انداز

ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے لیں

احمد جاوید صاحب بحیثیت فلسفی اور دانشور ملک کی معروف شخصیت ہیں۔ پہلے ان کی شہرت اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ علماء کی مخالفت کرتے ہیں اور پر زور انداز میں کرتے ہیں۔ اب انہوں نے وہی بات بانداز دگر کہی ہے اور فرمایا ہے کہ غامدی صاحب علماء کی بہ نسبت دین کو بہتر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مان لیا کہ علماء میں ان جتنا چرب زبان اور لفاظ کوئی نہیں اور وہ بہت اچھے مقرر ہیں لیکن تقریر اچھی کر لینا کیا اتنی بڑی خوبی ہے کہ ہم یہ بھول جائیں کہ ان کی تقریروں کا Content کیا ہوتا ہے؟ یعنی وہ اپنی تقریروں میں کس دین کو پیش کرتے ہیں؟ جب پاکستان بھر کے علماء کا یہ کہنا ہے کہ وہ بدعقیدہ ہیں اور ان کے نظریات ٹھیک نہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اپنے غلط نظریات خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں بلکہ یہ خوبصورت پیش کش بھی ایک طرح سے جرم اور مکر کی صورت ہے کہ اس کے سبب وہ اپنے غلط نظریات کو اتنی خوبصورتی اور ملمع کاری سے پیش کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی قبولیت کی راہ کھلتی ہے۔

دوسری بات جناب احمد جاوید صاحب نے یہ کہی کہ غامدی صاحب جو دین پیش کرتے ہیں اس کا جواز یہ ہے کہ وہ بطور مصلحت پورا دین پیش نہیں کرتے بلکہ صرف دین کے اہم اور بنیادی اجزاء پیش کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں غامدی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں اس کی تردید کر دی بلکہ سختی سے تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان پر الزام ہے کہ وہ پورا دین پیش نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہمیشہ پورا دین پیش کرتے ہیں اور اس میں انہوں نے کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا۔ اب احمد جاوید صاحب سے کوئی پوچھے کہ بزرگو! آپ کو شاہ سے زیادہ شاہ پرست بننے کی کیا ضرورت تھی؟

تیسری بات احمد جاوید صاحب نے یہ کہی ہے کہ غامدی صاحب کی علمیت اور ان کے دینی

اسلوب کو ان کے متبعین سے نہ جانچو۔ یہاں انہوں نے غامدی صاحب پر معترض ان علماء کے موقف کی گویا تصدیق کر دی ہے جو کہتے ہیں کہ غامدی صاحب نے دین کی اس طرح تشریح کی ہے کہ ہمارے مغرب گزیدہ طبقات جو دین پر عمل کرنے کی بجائے لبرل انداز میں اپنی خواہشات نفس اور مغربی تہذیب کے اصول واقدار کو اپناتے تھے جیسے موسیقی سننا، عورتوں کا پردہ نہ کرنا، عورتوں مردوں کا مغربی لباس پہننا، مردوں کا داڑھی مونڈنا، قرآن کے ہوتے ہوئے سنت کی ضرورت نہ سمجھنا، مولویوں کا مذاق اڑانا....وغیرہ تو غامدی صاحب نے دین کی اس طرح تشریح کی ہے کہ ان سب چیزوں کو جائز قرار دیا ہے اور قرآن وسنت سے ثابت کر دیا ہے لہٰذا اب ان طبقات کا ان چیزوں کو گناہ سمجھنے کا احساس اور گلٹ (Guilt) ختم ہو گیا ہے تو وہ خوش ہیں اور غامدی صاحب کے تصور دین کی خوب حمایت کرتے ہیں۔ گویا احمد جاوید صاحب نے بالواسطہ طور پر علماء کے ان خدشات کی تصدیق کر دی ہے کہ غامدی صاحب دین کی تشریح مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے مطابق کرتے ہیں اور لوگوں کو لبرل اور سیکولر اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں تا کہ وہ خوش دلی سے مغرب کی پیروی کریں اور احساس گناہ سے بچ جائیں۔

آخر میں ہم احمد جاوید صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ ہم نے ان کا ایک وڈیو کلپ دیکھا تھا جس میں انہوں نے علماء کرام اور ان کے محبین سے معذرت کی کہ جوش خطابت میں ان کے منہ سے ایسے جملے نکل گئے جو علماء کی اہانت کہے جا سکتے تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ان کی بڑائی ہے، اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا اور اس پر معذرت کر لینا بڑے آدمی کا شیوہ ہوتا ہے اور نیچ اور کم ظرف لوگوں کو اس کی توفیق کم ہی ملتی ہے۔ اس لیے ہم ان سے درخواست کریں گے کہ غامدی صاحب کے بارے میں جو انہوں نے کہا اور ان کی بکثرت تعریف وتوصیف کر کے ان کے غلط نظریات کو مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنانے کی جو سعی انہوں نے کی، وہ اسے اپنی غلطی سمجھتے ہوئے علماء کرام اور عامتہ المسلمین سے معذرت کر لیں۔ اس میں ان کی بڑائی ہے لہٰذا انہیں اس میں شرمندگی وغیرہ کے احساس کو جگہ نہیں دینی چاہیے۔

اسلام اور تجدد سید خالد جامعی

غامدی صاحب۔علمیت اور حسنِ اخلاق؟

احمد جاوید صاحب کو غامدی صاحب کی علمیت، حسنِ اخلاق اور خوش فکری سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں

[یہ اس موضوع پر مصنف کے سوشل میڈیا پر ایک طویل مضمون کی تلخیص ہے جو ادارے نے مرتب کی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اصل مضمون۔]

جناب احمد جاوید صاحب نے ایک حالیہ وڈیو کلپ میں غامدی صاحب کی علمیت خصوصاً ان کی عربی دانی اور ان کے حسن اخلاق اور خوش فکری کی بہت تعریف کی ہے۔ ہمارا تجربہ چونکہ اس کے بالکل برعکس ہے لہٰذا ہم وہ احمد جاوید صاحب سے اور قارئین البرہان سے شیئر کرنا چاہیں گے۔

۱۔ ۱۹۸۵ء میں ان کی پہلی کتاب ڈاکٹر منیر احمد صاحب نے میزان حصہ اوّل کے نام سے دارالاشراق سے شائع کی۔ یہ کتاب میر شکیل الرحمان صاحب کے گھر پر ڈاکٹر صاحب نے ہمیں تحفتاً پیش کی۔ ہمارے ایک دوست شکیل عثمانی (مرحوم) اُس وقت کے کنٹرولر ریڈیو اسلام آباد نے ہمیں اسی کتاب کا دوسرا نسخہ پیش کیا، جو انہیں تحفے میں خورشید ندیم صاحب نے اپنے دستخطوں سے پیش کیا تھا۔

لیکن غامدی صاحب نے میزان طبع ۲۰۰۷ء میں لکھا کہ 'میزان کی تصنیف کا کام میں نے ۱۹۹۰ء میں شروع کیا وہ آج سترہ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ یہ اس پورے دین کا بیان ہے جو اللہ کے پیغمبر کی وساطت سے انسان کو دیا گیا' (میزان طبع چہاردہم سطر ۵ ص ۶۳۵ المورد لاہور) سوال یہ ہے کہ اگر غامدی صاحب نے میزان ۱۹۹۰ء میں لکھنا شروع کی تو میزان ۱۹۸۵ء میں کیسے شائع ہوگئی؟

یہ دعویٰ کہ میزان ۲۰۰۷ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی اس لیے بھی غلط ہے کہ انہوں نے میزان ۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۲ء میں بھی شائع کی تھی۔

پھر راقم نے غامدی صاحب کے دینی مضامین پر نقد کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں غامدی

صاحب کے میزان میں ان کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں ان کی کتاب میزان، مقامات اور برہان کا محاکمہ کیا گیا تھا۔ ان مضامین میں میزان کی جن جن عبارات پر نقد کیا گیا غامدی صاحب نے ۲۰۱۷ء کی نئی اشاعت سے وہ تمام عبارات ہی حذف کر دیں۔ ان مضامین میں ان کے جن غلط اصولوں پر گرفت کی گئی، غامدی صاحب نے وہ اصول بھی حذف کر دیے لیکن ہماری تنقید کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

۲۔ غامدی صاحب کی عربی دانی اور غلط بیانی کی بعض اور مثالیں:

جامعۃ الرشید کے طالب علم حسن الیاس اور ان کے رشتہ دار احمد بنوری جو علامہ یوسف بنوری کے پوتے ہیں دونوں غامدی صاحب سے متاثر تھے انہیں مقامات ۲۰۰۷ء دی گئی کہ یہ کتاب غائب کر کے مقامات طبع اوّل ۲۰۰۸ء شائع کی گئی ہے تو دونوں حضرات نے اس بد دیانتی پر خاموشی اختیار کر لی۔ یاد رہے کہ غامدی صاحب کی مقامات ۲۰۰۷ء اردو، انگریزی اور عربی میں تھی۔ وہ انہوں نے مارکیٹ سے غائب کرا دی اور نئی مقامات سے انگریزی اور عربی حصہ کیوں نکال دیا۔ یہ کیوں ہوا؟

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۲۰۰۷ء تک غامدی صاحب کے ادارے الاشراق اور المورد کے زیر اہتمام جس قدر بھی کتابیں اور کتابچے شائع کیے گئے ان کے آخر میں غامدی صاحب کی زیر طبع کتابوں کی فہرست بھی شائع ہوتی تھی جس میں عربی تفسیر الاشراق کا ذکر بھی ہوتا تھا لیکن ۲۰۰۷ء میں ماہنامہ ساحل کراچی نے غامدی صاحب کی عربی دانی کی حیثیت کھول دی تو غامدی صاحب نے اس زیر طبع تفسیر کا اشتہار شائع کرنا بند کر دیا اور آج تک یہ زیر طبع تفسیر سامنے نہیں آسکی۔ صرف یہی نہیں بلکہ غامدی صاحب نے اپنی زیر تسوید تصنیفات کی فہرست سے بھی اس کتاب کا نام خارج کر دیا۔ غامدی صاحب نے زندگی میں صرف ایک مضمون عربی میں لکھا 'شرح شواھد فراھي' ۲۵ صفحات کے اس مضمون میں عربی زبان، بیان، انشاء، املاء، صَرف، نحو اور تذکیر و تانیث کی چھ سو سے زیادہ غلطیاں تھیں۔ ڈاکٹر رضوان علی ندوی مرحوم نے غامدی صاحب کی عربی پر تنقیدی مضمون لکھا جو ساحل ۲۰۰۷ء کے شماروں میں شائع ہوا تو غامدی صاحب نے اپنی کتاب مقامات طبع دوم ۲۰۰۷ء بازار سے غائب کرا دی اور مقامات کے اگلے ایڈیشن سے عربی حصہ بھی نکال دیا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۰)

اسلام اور تجدد ڈاکٹر محمد امین

مسلم معاشرے میں تجدد

* مغرب کی الحادی فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہو کر دین کی ہر تشریح تجدد ہے
* تجدد نہ صحیح اجتہاد ہے نہ صحیح تجدید، یہ بدعت و گمراہی ہے
* بعض نامور روایتی علماء کا فروغ تجدد میں کردار

اجتہاد اور تجدید

نبی کریم ﷺ کی معروف حدیث ہے: "كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ وَكُلُّ ضَلاَلَةٍ فِي النَّارِ"[۱] یعنی ہر نئی بات، ہر جدید امر بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا مآل جہنم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: "من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد"[۲] یعنی جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کی، جو اصلاً اس میں نہیں، تو وہ بات مردود (قابل رد) ہے۔

قارئین کرام! نبی کریم ﷺ کی جو دو احادیث ہم نے پیش کی ہیں ان میں پہلی حدیث میں کہا گیا ہے کہ ہر نئی بات، ہر نیا کام بدعت ہے، گمراہی ہے اور وہ جہنم میں لے جانے والا ہے۔ دوسری حدیث میں اس کی تحدید کر دی گئی کہ ہر وہ نئی بات، نیا کام قابل رد ہے جس کی اصل دین میں نہ ہو۔ ان احادیث پر غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ جس محدثة (امر جدید) اور احداث فی الدین کی مذمت نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں وہ نہ اجتہاد ہے نہ تجدید۔ اجتہاد کسی نئے امر میں وہ نیا حکم ہوتا ہے جس کی اصل دین میں ہو۔ اسی طرح تجدید ان نئے امور کو جن کی اصل دین میں نہ ہو، چھوڑ کر ان امور کی طرف پلٹ جانا ہے جن کی اصل دین میں ہو۔ یہ وہ بنیادی شرط اور اصول ہے جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کیونکہ اس کے ترک سے قرآن مجید کے اکمل و اشمل ہونے پر اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ختم نبوت کے تصور پر حرف آتا ہے۔

---

[۱] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۸۶۸

[۲] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۶۹۷

تجدد کے اسباب

۱۹۲۴ء میں سقوط خلافت عثمانیہ صرف مسلمانوں کے سیاسی نظام کی شکست ہی نہ تھی بلکہ ان کی تہذیب اوران کے نظام زندگی کی شکست بھی تھی۔اس شکست کا ایک پہلو اور سبب داخلی تھا اور وہ یہ کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اسلام پر صحیح طریقے سے عمل درآمد میں ناکام ہوگئے۔گویا یہ مسلمانوں کی ناکامی تھی اسلام کی ناکامی نہ تھی۔مسلمانوں نے اسلام کے بہترین اصولوں پر عمل کیا توعروج پاگئے،ان پرعمل چھوڑ دیا تو زوال پذیر ہوگئے۔اس زوال کا دوسرا پہلو اور سبب مغرب کی الحادی فکروتہذیب کا دنیا پر غلبہ تھا۔جب عالم اسلام زوال پذیر تھا تو متعدد عوامل کی بناء پر مغرب کی تہذیب ایک آندھی کی طرح اٹھی اور ساری دنیا پر چھا گئی۔مغرب کی یہ تہذیب مذہب (مسیحیت) کی راکھ سے ققنس کی طرح اٹھی تھی اور سرتاپا انکارِ خدا اور رسول وآخرت پر مبنی تھی اور اس جہالت کوعلم،علمیت اور استدلال کا خوبصورت لبادہ پہنا کر سامنے آئی تھی۔اس پر طرہ یہ کہ اس کے علم بردار مغربی ممالک کا خمیر اسلام اور مسلمانوں سے نفرت اور انتقام سے اٹھا تھا۔

یہاں اس الحادی تہذیب اور اس کے علمبردار مغربی معاشرے وممالک کے دورویے سامنے آتے ہیں۔ایک مسلمانوں کو سیاسی،عسکری اور معاشی لحاظ سے کچلنا اور دوسرے فکری لحاظ سے کنگال کرنا تاکہ وہ اس کے مقابلے میں اٹھ نہ سکیں۔پہلے رویے کی بناء پر انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلمان ملکوں پر قبضہ کرلیا اور انہیں خوب لوٹا،کھسوٹا،نچوڑا اور کچلا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد جب وہ انہیں آزاد(؟) کرنے پر مجبور ہوئے اور اگلی نصف صدی میں بعض مسلم ممالک سر اٹھانے لگے تو انہوں نے حیلے بہانے دوبارہ ان کو اپنی عسکری،سیاسی اور معاشی قوت سے کچل دیا۔عراق،لیبیا اور افغانستان روندے جا چکے۔شام اور یمن روندے جارہے ہیں اور ایران،پاکستان،نائیجیریا پائپ لائن میں ہیں۔

اس کا دوسرا پہلو فکری تھا۔انہوں نے مسلم ممالک پر قبضے کے دوران مسلم تہذیبی واجتماعی ڈھانچے کو توڑ کر اسے اپنی فکروتہذیب پر استوار کیا۔اس کے نتیجے میں ایسے مسلم مفکرین ومصلحین سامنے آنے لگے جنہوں نے مغربی فکروتہذیب کی بالادستی کو ذہنی طور پر قبول کرلیا اور انہوں نے اسلام کی ایسی تشریح کرنی شروع کردی جس سے مغربی فکروتہذیب قابل قبول بلکہ قابل پیروی

لگے۔اور انہوں نے یہ کہہ کر مسلمانوں کو اس کی پیروی پر اکسایا کہ اس میں مسلمانوں کی دنیاوی بہتری ہے۔انہوں نے اپنی اس فکر اور رویے کو پھیلانے میں استعمار سے مدد بھی لی۔اس فکر اور رویے کے سرخیل برصغیر میں سر سید احمد خان تھے جنہوں نے یہ سب کیا اور روایتی اسلام کے مقابلے میں تجدد کا رویہ اپنایا۔اس کے دوسرے بڑے سمبل غلام احمد قادیانی تھے جنہوں نے استعمار کی حمایت سے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہو گئے۔

یہ فکر اور رویہ برصغیر میں تعلیم کے میدان میں علی گڑھ کے تعلیمی ماڈل اور دینی حلقوں میں منکرین حدیث کے تسلسل کی صورت میں آگے بڑھتا رہا۔تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں اس کے بڑے مناد غلام احمد پرویز تھے اور اس وقت جاوید احمد غامدی ہیں جبکہ بھارت میں یہ کام مولانا وحید الدین خان نے کیا۔

روایت اور تجدد

تاہم تجدد کے ان غالی علم برداروں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے روایت، روایتی اسلام یا جمہور کے تصور دین کو تو نہیں چھوڑا لیکن شعوری یا لاشعوری طور پر مغرب کی الحادی فکر و تہذیب سے متاثر ہو گئے۔روایت کے لحاظ سے بھی ان کی دینی خدمات مسلّمہ ہیں بلکہ ان کا بڑا مقام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مغربی فکر و تہذیب سے متاثر و مغلوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے جس کا اظہار ان کے فکری و عملی رویے سے ہوتا ہے۔ہم اس کی کچھ مثالیں عرض کرتے ہیں۔

ان میں ایک بڑا نام مولانا مودودیؒ کا ہے جو روایت سے منقطع نہیں ہوئے اور اس میں ان کی بڑی دینی خدمات ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا تصورِ اقامتِ دین اور قیام اسلامی ریاست مغرب کے فکری، سیاسی، تہذیبی غلبے کا ردعمل تھا جس کے پس پردہ یہ نیک خواہش تھی کہ مسلمانوں کو بھی غلبہ وقوت ملے۔اس سے اسلام کو سیاسیانے (Politicization of Islam) کی فکری روش سامنے آئی۔لیکن اس کا سب سے بڑا مظہر ان کا قیام پاکستان کے بعد مغرب کی کفر پر مبنی جمہوریت کو اسلامیانے (Islamization of Westren Democracy) اور اسے 'اسلامی جمہوریت' کا نام دے کر قابل قبول بنانے کا عمل تھا۔اسی طرح کا رویہ مفتی تقی عثمانی صاحب کا ہے جن کا روایت سے تمسک معروف اور دینی خدمات مسلّمہ ہیں

لیکن مغرب کے الحادی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ایک بڑے آلے اور ادارے یعنی بنکنگ کو اسلامیانے کا عمل سرانجام دے کر اور اسے ''اسلامی بنکنگ'' قرار دینے کا عمل بھی انہی کا 'کارنامہ' ہے۔

تجدد کی بالواسطہ حمایت

اسی طرح تجدد کی حمایت اور مغرب کی حمایت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ مغرب اور اس کے غیر اسلامی افکار وتہذیب کی براہ راست حمایت کرنے کی بجائے ان لوگوں کی حمایت کی جائے جو اس تجدد کے غالی علم بردار ہیں۔ اس رویے کے علم بردار لوگوں کی نمائندگی کے نمونے کے طور پر ہمارے سامنے دو افراد ہیں۔ ایک مولانا زاہد الراشدی صاحب جن کے اپنے خیالات تو بڑی حد تک معتدل اور قابل قبول ہیں لیکن اپنے صاحبزادے عمار ناصر صاحب کی حمایت وہ ہر قیمت پر کرتے ہیں جو غالی متجدد جاوید غامدی صاحب کے تلمیذ اور ان کی فکر کے علم بردار ہیں۔ اس کی دوسری مثال معروف دانشور اور صوفی احمد جاوید صاحب کی ہے جو بلاشبہ روایت کے آدمی ہیں لیکن حال ہی میں انہوں نے بھی غالی متجدد جاوید غامدی صاحب اور ان کی فکر کی حمایت کی ہے۔ یہ بھی تجدد کی بالواسطہ حمایت ہی کا ایک انداز ہے۔

تجدد کے نقصانات

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پاکستان میں اسلام غالب نہیں ہوا، یہاں شریعت نافذ نہیں ہوئی تو جہاں اس کے دوسرے بہت سے اہم اسباب ہیں، ان میں سے ایک اہم سبب مغرب کی فکر اور اس کے سیاسی اور معاشی نظام کو اسلامیانا اور اپنانا اور اسے اسلامی لحاظ سے قابل قبول قرار دینا بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا پاکستانی معاشرہ اگرچہ جذباتی لحاظ سے پختہ مسلمانوں پر مشتمل ہے (جو اسلام، قرآن اور رسول کے نام پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں اور مذہبی رسوم اور Rituals پر سختی سے کاربند ہیں) لیکن عملی زندگی میں، اپنے اخلاق میں، اپنی قدروں میں، اپنے اعمال میں وہ کافر معاشروں سے بھی بدتر ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ مذکورہ بالا اقدامات کی وجہ سے پاکستانی معاشرے نے عملاً مغربی فکر وتہذیب کی حبِّ دنیا، مادہ پرستی اور اس کے سیکولرازم و لبرل ازم جیسے نظریات کو عملاً قبول کر لیا ہے۔

ہمیں اس پر بھی شرح صدر ہے کہ آج مسلمانوں کے زوال سے نکلنے اور شاہراہ اسلام پر

چل کر دنیاوآخرت میں کامیابی پانے کا بنیادی نسخہ اگر مثبت پہلو سے روایتی اسلام کی طرف لوٹنا ہےتو سلبی پہلو سے یہ مغرب کی الحادی فکروتہذیب کے رد کے لزوم کا متقاضی ہے۔نفی کے بغیر اثبات بے معنی ہے۔جھوٹے خداؤں کے انکار کے بغیر ایک خدا کے معبود ومطاع ہونے کا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا۔معاف کیجیے گا ان معنوں میں اللہ کے منکر تو کفار قریش بھی نہ تھے۔قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ اللہ کو مانتے تھے لیکن کچھ اور خداؤں کو بھی مانتے تھے اور مانتے رہنا چاہتے تھے اور اس پر مصر تھے۔جھگڑا تو یہی تھا۔آج بھی اصل مسئلہ اور اصل چیلنج یہی ہے کہ اسلام کی طرف لوٹنا بے معنی ہے جب تک ہم غیر اسلام یعنی مغرب کی الحادی فکروتہذیب کورد نہ کردیں۔اس لیے مغرب کی الحادی فکروتہذیب کا ردعین تقاضائے اسلام ہے،شرعی تقاضا ہے۔مغربی فکروتہذیب کے غیر اسلامی ہونے کے نقلی اور عقلی دلائل اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا دہرانا تحصیل حاصل ہے۔اس پر ہماری کئی کتابیں اور سیکڑوں مضامین موجود ہیں۔اس موضوع پر انگریزی،عربی،اردو میں اتنا لٹریچر موجود ہے کہ ہزاروں کتابوں اور مضامین کی فہرست بن سکتی ہے۔ایسی ایک طویل فہرست ہم نے کچھ عرصہ پہلے البرہان میں شائع بھی کی تھی جو سید خالد جامعی صاحب نے مرتب کی تھی۔{ضمناً،اہلِ علم سے درخواست ہے کہ کوئی صاحب اس پر توضیحی کتابیاتی فہرست(Annotated Bibliography) تیار کردیں}۔

ہم نے جو کہا ہے وہ حقائق ہیں،الزام تراشی نہیں۔تاہم جس عہد میں ہم رہ رہے ہیں وہ مسلک پرستی اور شخصیت پرستی کا عہد ہے۔مولانا مودودی مرحوم،مفتی تقی عثمانی صاحب،مولانا زاہدالراشدی صاحب اور احمد جاوید صاحب،سب کا ایک حلقۂ اثر اور حلقۂ فکر ہے۔وہ کب اس طرح کی بات سننے اور اس پر غور کرنے پر آمادہ ہوں گے؟اگرچہ حق ہی اس امر کا حق دار ہوتا ہے کہ اس پر غور کیا جائے،اسے مانا جائے اور اس کا اعلان کیا جائے۔

اخلاص کا مسئلہ

نیت اور اخلاص کا معاملہ اگرچہ بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے اور ہم کسی کا سینہ چیر کر نہیں دیکھ سکتے لیکن کسی شخص کا سوچا سمجھا رویہ اور اس کے اعمال بہرحال اس کی نیت کے شاہد ہوتے ہیں۔مثلاً اگر غلام احمد قادیانی رورو کر کہے کہ میں اخلاص سے یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی

بہتری اسی میں ہے کہ وہ انگریزی استعمار سے وفادار رہیں اور اس کی پیروی کریں۔ اور جہاں تک خاتم النبیین کے مفہوم کا تعلق ہے تو یہ ایک علمی مسئلہ ہے اور تاویل کا اختلاف ہے کہ جمہور علماء اسے "خاتَم" پڑھتے ہیں اور میں "خاتِم" پڑھتا ہوں ورنہ سارے مسلمانوں کی طرح قرآن اور سنت کو تو میں بھی حجت سمجھتا ہوں۔ تو کیا ہم اس کے 'اخلاص' کو قبول کر لیں گے اور اس کے موقف کو مان لیں گے؟

راقم کا بچپن جس گاؤں میں گزرا وہاں ہمارے محلے اور گاؤں میں کافی قادیانی تھے۔ وہ لوگ مجھے بھی ایک ایسی مجلس وعظ میں لے گئے جہاں قادیانی خلیفہ نے تقریر کرنی تھی۔ تقریر کے بعد انہوں نے رو رو کر دعا کرائی۔ ان کا حلیہ مسلمان علماء جیسا تھا اور تقریر بھی قرآن وسنت کے حوالوں سے مزیّن تھی۔ سچی بات ہے مَیں خاصا متاثر ہوا اور کئی دنوں تک سوچتا رہا کہ مسلمان ان کو غلط کیوں کہتے اور برا کیوں سمجھتے ہیں؟ اس وقت مَیں غالباً مڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ سمجھ دار ہونے پر الحمدللہ ایسے خلجانوں سے نجات مل گئی۔

اگر کوئی شخص دیانت داری اور اخلاص سے یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کی بہتری مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی پیروی میں ہے لہٰذا اسلام کی ایسی تشریح کی ضرورت ہے جو مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ہو تو ہمارے نزدیک یہ تجدد ہے، فکری افلاس ہے، بدعت ہے، فکری غلطی ہے، گمراہی ہے۔ لہٰذا ہم ایسے شخص کے 'اخلاص' کو اور اس کے موقف کو رد کر دیں گے۔ اور ایسا شخص اگر استعمار کی حمایت اور مدد سے مسلمانوں میں تجدد پھیلائے تو اسے مخلص سمجھنے کی بجائے استعمار کا خدمت گزار سمجھنا چاہیے۔ اور اگر ایسا شخص اپنے ذاتی مفاد کے لیے، جاہ ومنصب ودولت کے لیے یہ روش اختیار کرے، مغربی فکر وتہذیب کے صحیح اور عظیم ہونے اور اس کے علمبرداروں کی عظمت کے گیت گائے اور مسلمانوں کا ذکر حقارت ومذمت سے کرے تو ایسے شخص کے اسلام اور مسلمانوں کا غدار ہونے اور استعمار کا ایجنٹ ہونے کا فیصلہ غلط اور مبالغہ پر مبنی نہ ہوگا۔ ھذا من عندنا والعلم عند اللہ.

اسلام اور پاکستان/فقہ و قانون

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین[۱]

۱۸ سال سے کم عمر شرعاً بالغ مسلمان لڑکی کا نکاح غیر قانونی ہے

اسلام آباد ہائیکورٹ کا خلافِ شریعت فیصلہ

اہم قانونی اور اصولی نکات

[یہ مضمون پچھلے ماہ البرہان میں شائع ہونے والے مضمون سے مختلف ہے]

اسلام آباد ہائیکورٹ کے جسٹس بابر ستار صاحب نے حال ہی میں اسلام کے عائلی قانون اور صغرسنی کے نکاح کے حوالے سے ایک فیصلہ دیا ہے جسے ملی مجلس شرعی اور اس کے علماء ومفتیان کی ایک کمیٹی نے غیر شرعی قرار دیا ہے اور دینی حلقوں اور دین دار وکلاء کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اسے منسوخ کرانے کے لیے اقدامات کریں۔ ملی مجلس شرعی کا فیصلہ مختصر تھا اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ذرا تفصیلی گفتگو کی جائے۔

صورت معاملہ

اس کیس میں صورت معاملہ یہ ہے کہ ایک مسلمان لڑکی (عمر چودہ سال سے زیادہ) نے گھر سے بھاگ کر والدین کی مرضی کے خلاف اپنے آشنا کے ساتھ نکاح کرلیا۔ لڑکی کے بھائی نے پولیس میں اغواء کا مقدمہ درج کروایا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اسلام آباد نے لڑکی کے اس بیان پر کہ وہ بالغ ہے اور اس نے نکاح بلا جبر آزاد مرضی سے کیا ہے، نکاح کو برقرار رکھنے کا حکم جاری کیا۔ لڑکی کی والدہ نے اسلام آباد ہائی کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کی۔ جسٹس بابر ستار پر مشتمل سنگل بنچ نے اس بنیاد پر کہ لڑکی کی عمر ۱۸ سال سے کم ہے، لہٰذا وہ بچی (Child/Minor) ہے اور معاہدۂ نکاح نہیں کرسکتی، اس نکاح کو فسخ کردیا، اسے زنا بالرضا کے مصداق قرار دیا اور لڑکی کو والدین کے ساتھ بھجوادیا۔

گویا جج صاحب کا قانونی موقف یہ ہے کہ:

i- ۱۸ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح باطل ہوتا ہے، ہوتا ہی نہیں کیونکہ ۱۸ سال سے کم عمر کی

---

[۱] ایم فل فقہ واصول فقہ (سعودی عرب)، پی ایچ ڈی، اسلامی قانون (امریکہ)، کامن لاء میں سرٹیفکیٹ، یونیورسٹی آف کیمبرج، برطانیہ

لڑکی قانون کی رو سے 'بچی' ہوتی ہے اور وہ معاہدۂ نکاح نہیں کر سکتی، خواہ وہ شرعاً بالغ ہی ہو۔

ii۔ یہ بات کہ ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکی 'بچی' ہوتی ہے اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق کے چارٹر (UNCRC) میں لکھی گئی ہے جسے پاکستان نے بھی قبول کیا ہے اور اپنے قوانین کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش بھی کی ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کے زمانے میں جو قوانین بنائے گئے اور پاکستان میں بھی جو قوانین نکاح، طلاق، وراثت، قانون مدنی، قانون فوجداری، ڈرائیونگ لائسنس، شناختی کارڈ بنوانے وغیرہ کے لیے وضع کیے گئے ہیں ان میں عمر کا تعین ۱۸ سال ہی کیا گیا ہے۔

iii۔ قرآن وسنت اور فقہ بلوغت (یعنی Major ہونے) کا اظہار آثار بلوغت سے کرتے ہیں نہ کہ تعین عمر سے۔ اس لیے جن فقہاء نے عمر کے تعین کی کوشش کی بھی ہے تو ان میں اختلاف واقع ہوا ہے لہٰذا ہم ان سے استفادہ نہیں کر سکتے اگرچہ سپریم کورٹ کا فیصلہ یہی ہے کہ جہاں قانون واضح نہ ہو وہاں اسلام کے عائلی قانون کا اطلاق کیا جائے۔

iv۔ پاکستان کے موجودہ عائلی قوانین میں صراحت کے ساتھ کہیں نہیں لکھا کہ ایک مسلمان لڑکی کی نکاح کے وقت کم از کم عمر کتنی ہونی چاہیے اور نہ یہ لکھا ہے کہ بلوغت کے اثبات کے لیے آثار بلوغت قانوناً کفایت کرتے ہیں لہٰذا ہمیں اقوام متحدہ کے قانون اور دیگر پاکستانی قوانین پر عمل کرنا پڑا جن میں بلوغت (Mojor ہونے) کی عمر ۱۸ سال مقرر کی گئی ہے اور ۱۸ سال سے کم عمر کے ہر فرد کو بچہ (Child/minor) قرار دیا گیا ہے۔

جسٹس بابر ستار صاحب کے اس فیصلے کو ہم مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر غیر اسلامی اور غیر شرعی سمجھتے ہیں:

ا۔ شریعت نکاح کے لیے عمر کا تعین نہیں کرتی۔ اس نے نکاح (بمعنی نکاح ورخصتی) کو بلوغت سے مشروط کیا ہے نہ کہ عمر سے۔ بلوغت اپنے آثار سے ظاہر ہو جاتی ہے اور طبی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے (Verifiabel Medically & Physically)۔ اس کی حکمت واضح ہے کہ اس کا اثبات ہر فرد کے لیے فطری طور پر آسان اور قابل فہم ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالم گیر دین ہے اور ہر آدمی کے لیے ہے اس لیے شریعت نے اپنے احکام کو ہر مسلمان کے لیے قابل عمل بنانے کے لیے اس کی بنیادی ضروریات کو ہر فرد کی رسائی میں رکھا ہے۔ جیسے شریعت نے جب

مکلفین پر نماز فرض کی تو وقت کے لیے سورج کی حرکت کو معیار بنایا کہ طلوع سورج سے پہلے نمازِ فجر پڑھو اور اس کے غروب ہوتے ہی نمازِ مغرب پڑھو اور....روزے فرض کیے تو چاند کی حرکت کو معیار بنایا کہ چاند نظر آئے تو روزہ رکھنا شروع کرو اور چاند دیکھو کر ہی عید کرو کیونکہ چاند اور سورج کو دیکھنا دنیا کے ہر آدمی کے لیے، خواہ وہ کہیں بھی ہو، آسان ترین ہے، اس میں اس کے لیے آسانی ہے اور اس کے لیے اسے کسی خصوصی اہتمام اور آلات کی ضرورت نہیں۔

شریعت نے نکاح کے لیے کسی خاص عمر کو شرط نہیں بنایا کیوں کہ وہ ظنی الثبوت ہے۔ایک لڑکی نو سال کی عمر میں بھی بالغ ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی وجہ سے پندرہ سال کی عمر میں بھی بالغ نہ ہو۔گرم علاقوں کی لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتی ہیں بہ نسبت سرد علاقوں کے۔صحت مند لڑکی جلد بالغ ہو سکتی ہے بہ نسبت بیمار و کمزور کے۔کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی جلد بالغ ہو سکتی ہے بہ نسبت غریب گھرانے کے جہاں اسے اچھی غذا میسر نہ ہو۔

۲۔ اگر لڑکی شرعاً بالغ نہ ہو تو بھی کسی مصلحت سے اس کا والد (یا ولی) اس کا نکاح (یعنی نکاح بدون رخصتی) کر سکتا ہے اور یہ اصول شرع اسلامی کے علاوہ دیگر قانونی نظاموں میں بھی موجود ہے کہ بچوں کے معاملات والدین نمٹاتے ہیں جب تک وہ بالغ نہ ہو جائیں جیسے ایک بچے کے نام پر بینک اکاؤنٹ کھل سکتا ہے لیکن اسے آپریٹ والدین یا کوئی دوسرا بالغ گارڈین ہی کرے گا۔چنانچہ شرع اسلامی میں والد یا ولی چھوٹے بچے یا بچی کا نکاح کر سکتا ہے تاہم بالغ ہونے پر لڑکے یا لڑکی کو حق ہوگا کہ وہ اسے باقی رکھے یا فسخ کردے۔

۳۔ مسلمان کنواری لڑکی کا نکاح اس کا والد یا ولی کرے گا جس میں اس کی رضامندی شامل ہوگی لیکن وہ اپنا نکاح خود نہیں کرے گی۔اسلام مسلمانوں میں خصوصاً لڑکیوں میں حیاء پیدا کرنا چاہتا ہے اور مخلوط معاشرت کو رد کرتا ہے۔لہٰذا مسلم معاشرے میں خاوند ڈھونڈنا لڑکی کا کام نہیں بلکہ یہ کام والد یا ولی کا ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔

اگر کوئی مسلمان بالغ لڑکی یار آشنائیاں کرکے، والدین کی محبت اور تربیت کو ٹھکرا کر اور ان کے منہ پر کالک مل کر کسی یار کے ساتھ بھاگ جائے تو کسی مسلمان عالم کو والد/ولی کی غیر موجودگی میں اس کا نکاح نہیں پڑھانا چاہیے اور ایسا معاملہ اگر عدالت میں جائے تو جج کو اس نکاح کو باطل قرار دینا چاہیے۔اسلامی تعلیمات، اخلاق اور اقدار کا تقاضا یہی ہے چونکہ اس طرح کے نکاح

سے بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور بہت سی اسلامی تعلیمات و اقدار کی نفی ہوتی ہے لہٰذا اسے سدًّا للذریعہ بھی باطل ٹھہرایا جانا چاہیے۔

ہاں! اگر لڑکی کے ساتھ اس سلسلے میں ظلم و زیادتی ہو جیسے بالغ ہونے کے باوجود والد/ ولی اس کا نکاح نہ پڑھائے، یا اس کی مرضی کے خلاف کہیں پڑھانا چاہے یا غیر کفو میں پڑھانا چاہے تو لڑکی کو حق ہے کہ وہ عدالت میں جائے اور عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے ریلیف دے اور دلوائے۔

۴۔ یہ ایک قانونی پوزیشن ہے کہ ایک مسلمان لڑکے یا لڑکی کا نکاح (بمعنی نکاح و رخصتی) اس کے شرعاً بالغ ہونے پر ہو سکتا ہے۔ یہ شریعت کا کوئی ایجابی حکم نہیں ہے کہ جوں ہی لڑکا یا لڑکی شرعاً بالغ ہو جائے تو شریعت کا حکم ہے کہ فوراً اس کا نکاح کر دو۔ مسلم معاشرت یہ ہے کہ والدین عموماً انتظار کرتے ہیں کہ لڑکا ہو یا لڑکی، وہ ذرا سمجھدار ہو جائے، صحت مند ہو جائے، کچھ تعلیم حاصل کر لے، لڑکا ہو تو کسی کام روزگار سے لگ جائے، پھر ہی اس کا نکاح کیا جاتا ہے تاکہ وہ (لڑکا ہو یا لڑکی) بحیثیت خاوند یا بیوی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل ہو۔ یہ مسلم اقدار ہیں ان پر مسلم معاشرے میں عموماً عمل ہوتا ہے لہٰذا انہیں اقدار ہی رہنے دیا جائے، انہیں قانون کے شکنجے میں نہ کسا جائے۔

یہ بھی مسلم معاشرے کی روایات و اقدار میں سے ہے کہ لڑکا لڑکی عموماً ہم عمر ہوتے ہیں یا دو چار چھ برس کا فرق ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بڑی عمر کے مرد اور چھوٹی عمر کی لڑکی کا نکاح شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور غالباً دو چار فی صد سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہمارے ہاں معاشرتی روایت کے طور پر مرد عموماً ایک ہی نکاح کرتا ہے۔ (چار خواتین سے نکاح کی اجازت ہے، لیکن ایسا کرنے کا حکم نہیں ہے) اور پاکستان میں اندازاً ۹۰ فی صد مرد ایک ہی نکاح کرتے ہیں۔

یہ معاشرتی روایات مسلم ممالک میں بعض اوقات ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوتی ہیں مثلاً سعودی عرب میں ایک سے زیادہ نکاحوں کا رواج پاکستان کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح بڑی عمر کے مرد کا چھوٹی عمر کی بالغ لڑکی سے نکاح کا رواج بھی سعودی عرب میں پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اور یہ معاشرتی روایت نبی کریم ﷺ اور عہد صحابہؓ سے چلی آ رہی ہے۔ اسے عرف کہتے ہیں اور فقہ اسلامی عرف کا لحاظ کرتی ہے اور اس میں ہر اس عرف کو شرعاً قابل قبول سمجھا جاتا ہے جس میں کسی حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ ہو۔

اگر کسی کو اعتراض ہو کہ پاکستان میں چھوٹی عمر کی شادی کی وجہ سے لڑکیوں کی صحت کمزور رہ

جاتی ہے یا نومولود بچوں کی اموات زیادہ ہوتی ہیں تو اس کی تحقیق ہونی چاہیے۔ اگر یہ بات تحقیق سے ثابت ہو جائے تو اہل علم کو دعوت و تعلیم کے ذریعے لوگوں کی تربیت کرنی چاہیے کہ وہ اپنی چھوٹی عمر کی (بالغ لیکن) کمزور صحت والی بچیوں کا نکاح و رخصتی نہ کریں۔ اور حکومت کو بھی لوگوں کو ترغیب دینی چاہیے کہ وہ ایسا نہ کریں۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ ان روایات کو عرف کے درجے ہی میں رکھا جائے اور اگر کوئی ان میں اصلاح چاہتا ہے تو وہ دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ قانون سازی کا۔

۵۔ مسلمان والدین میں اولاد کی جلد شادی کرنے کا جو رجحان ہے، ہمارے نزدیک وہ فطری اور اسلامی ہونے کے علاوہ عقلی لحاظ سے بھی موزوں ہے کیونکہ:

- اس میں اولاد زیادہ پیدا ہونے کے امکانات قوی ہوتے ہیں کیونکہ میڈیکلی یہ بات ثابت ہے کہ نوجوانوں میں فرٹیلیٹی (اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت) زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کی اگر پندرہ برس کی عمر میں شادی ہو تو وہ پینتیس برس کی عمر تک آسانی سے پانچ سات بچوں کی ماں بن سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کی شادی ہی تیس برس کی عمر میں کریں تو بچے منطقی طور پر کم ہوں گے اور جن لڑکیوں کی شادی میں مزید تاخیر ہو جائے وہ بعض اوقات اولاد سے محروم رہتی ہیں۔ یاد رہے کہ اسلام میں اولاد کی کثرت محمود (قابل تعریف) ہے اور نبی کریم ﷺ نے اس کی ترغیب دلائی ہے۔

- اولاد میں سے لڑکے جلد بالغ ہو کر والد کا دست و بازو بن جاتے ہیں اور مالی و معاشرتی طور پر خاندان میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اور اولاد میں سے اگر لڑکی یا لڑکیاں ہوں تو اس عمر میں والد اکثر باروزگار ہوتا ہے اور لڑکیوں کی شادی کی ذمہ داری سے جلد عہدہ برآ ہونا اس کے لیے آسان ہوتا ہے۔

- ہمارا عہد فتنوں کا عہد ہے۔ معاشرے میں فحاشی، عریانی، مخلوط معاشرت اور مخلوط تعلیم عام ہے اور اب انٹرنیٹ نے تو بے حیائی اور ننگی فلموں اور ڈراموں کو ہر لڑکے لڑکی کی پہنچ میں دے دیا ہے لہٰذا نوجوانوں کے اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا ہونے کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ لہٰذا والدین کا اپنی اولاد کی جلد شادی کرنے کا رجحان شرعی لحاظ سے پسندیدہ ہے تاکہ ان کے بچے اخلاقی بے راہ روی سے بچ سکیں اور صالح زندگی گزار سکیں۔

۶۔ جنسی تسکین ہر انسان کا فطری اور بنیادی حق ہے کیونکہ اس کا داعیہ خالق (اللہ تعالیٰ) نے ہر انسان کے اندر فطری اور جبلی طور پر رکھا ہے اور اس لیے رکھا ہے کہ نسل انسانی کا سلسلہ جاری رہ سکے۔لہٰذا جب یہ داعیہ انسان کے اندر بیدار ہو جائے اور اس کے اندر جنس کی خواہش پیدا ہو جائے (یعنی وہ بالغ ہو جائے) تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہر مذہب نے انسان کی اس خواہش کو جائز طور پر پورا کرنے کے لیے تعلیمات عطا کی ہیں۔چنانچہ اسلام کے عائلی قانون میں بھی اس کی تفصیلی ہدایات موجود ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ نکاح یعنی جائز طور پر جنسی تسکین کو آسان بناتا ہے اور زنا (یعنی ناجائز طور پر جنسی خواہش کی تسکین) کے ہر راستے پر بند باندھتا ہے۔

یہ بات اتنی فطری اور عقلی ہے کہ جن معاشروں میں الٰہی تعلیمات وقوانین پر عمل نہیں ہوتا وہ بھی انسان کی جنسی تسکین کے جائز راستے کو کھلا رکھنے اور اسے بغیر کسی رکاوٹ پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں چنانچہ دنیا کے کئی ممالک میں خصوصاً امریکہ کی ۱۸ ریاستوں میں نکاح کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے اور کئی ممالک میں اگر عمر کی قید ہے بھی تو انہوں نے اس سے کم عمر کے نکاح کو جائز رکھا ہے اور اسے عدالتی اجازت سے مشروط کر دیا ہے۔ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلم معاشرے میں کوئی مخصوص حالات ہوں تو وہاں بھی اسے علماء وفقہاء کے مشورے سے عدالتی اجازت سے مشروط کیا جا سکتا ہے لیکن جب مسلم معاشرے میں عدالتی نظام ایسا ہو جو اسلامی شرائط پر پورا نہ اترتا ہو اور نہ جج اسلامی قانون کے ماہر ہوں تو مسلمان اس امر کو ایسی عدالت کی اجازت سے مشروط کرنے کی کبھی اجازت نہ دیں گے اور ہم بھی اس کی سفارش نہیں کرتے۔

غرض یہ محض ایک مفروضہ اور مِتھ (Myth) ہے کہ صغر سنی کا نکاح غلط ہے،نقصان دہ ہے، جرم ہے اور قابل سزا ہے۔اس مفروضے اور مِتھ کی تائید نہیں کی جا سکتی بلکہ ہمیں ان لوگوں کے موقف میں وزن محسوس ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ بعض مغربی حلقے مسلم ممالک میں نکاح کو اس لیے موخر کرنا چاہتے ہیں تا کہ ان کی آبادی کم ہو،تا کہ نوجوانوں کے اخلاق بگڑیں، وہ دین سے دور ہوں اور انہیں مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو اپنانے میں آسانی ہو۔

۷۔ سوال یہ ہے کہ جسٹس صاحب کیوں اصرار کرتے ہیں کہ مسلمان لڑکی لڑکے کے نکاح کے لیے عمر کا تعین ہونا چاہیے اور وہ بھی اٹھارہ سال کی عمر کا۔اور یہ محض ان کی سوچ اور تجویز نہیں بلکہ وہ مقننہ کو کہہ رہے ہیں کہ وہ اس کے مطابق قانون سازی کرے اور اسی بناء پر انہوں نے اس

کیس میں جوان کے پاس آیا تھا، انہوں نے اس پر عمل درآمد کر کے دکھا دیا ہے اور پندرہ سال کی مسلمان بالغ لڑکی کے نکاح کو باطل قرار دے کر فسخ کر دیا ہے اور اس نکاح کی بناء پر تعلق زن وشو کو زنا بالرضا کے مصداق قرار دیا ہے اور یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں اور اس معاملے میں ملوث لوگوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ مثلاً یہ لڑکی جو سات آٹھ ماہ خاوند کے ساتھ رہی ہے اگر اُس کے ہاں بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ بلکہ اگر کوئی مسلمان جسٹس صاحب کے اس فیصلے کو نزاع کی بنیاد بنانا چاہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ خود سرورِ دو عالم رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت عائشہؓ کے ساتھ صغر سنی میں ہوا تھا اور بالغ ہونے پر ۹ سال یا اس کے لگ بھگ ان کی رخصتی ہوگئی تھی۔ اس طرح کی سیکڑوں مثالیں صحابہ کرامؓ کی بھی موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر کے جج صاحبان کے انفرادی نظریات اور یک سمتی سوچ اسلام کے عالمگیر اور متفقہ و مستند عائلی قوانین سے متصادم نظر آتی ہے۔

ہماری رائے میں ان اسباب وعوامل کا جائزہ لینا ضروری ہے جو اس طرح کی سوچ کو جنم دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کے فکری اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قرآن وسنت کی بالادستی کو تسلیم نہ کرنا اور قرآن وسنت اور فقہ (یعنی قرآن وسنت کی روشنی میں مجتہدین وفقہاء کے کیے گئے اجتہادات) مل کر جو اسلامی قانون تشکیل دیتے ہیں [1] اسے ایک قانونی نظام تسلیم نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا۔

---

[1] یاد رہے کہ دنیا کا ہر علم اور ڈسپلن یا شعبۂ علم اپنی مخصوص اصطلاحات رکھتا ہے اور یہ اصطلاحات اس کے تصورِ علم اور ورلڈ ویو کے تناظر میں وضع ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ قانون اگرچہ عربی لفظ ہے لیکن موجودہ وضعی قانون میں یہ لفظ جن معنوں میں بولا جاتا ہے ان معنوں میں یہ لفظ مسلم علمی روایت میں استعمال ہی نہیں ہوا اور اس وقت بھی عرب دنیا میں استعمال نہیں ہوتا۔ وہاں حکم شرعی، شریعت، فقہ، اصول فقہ، اجتہاد اور قیاس جیسی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں اور یہ بات اصولی طور پر صحیح اور ضروری ہے لیکن مغربی تہذیب چونکہ اس وقت غالب ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں کثرت سے استعمال ہوتا ہے لہٰذا غلط العام ہونے کی وجہ سے ہم نے بھی اسے 'اسلامی قانون' کہہ دیا ہے۔ یاد رہے کہ مغرب نے بھی قانون کا لفظ جب ہم سے لیا تو اسے Canon کہا جو عربی لفظ 'قانون' کا بگڑا ہوا تلفظ ہے اور اس کا مطلب ہے مذہبی قانون۔

۲۔ مغربی فکر وتہذیب اور اس کے نظام قانون (آئین، قوانین اور اصولِ قانون) پر عمل درآمد کرنا اور اسے قرآن وسنت اور فقہ پر بالادستی دینا اور غالب کرنا۔

اور اب ان دونوں باتوں کی کچھ وضاحت

اسلامی قانون کی بالادستی

i۔ مسلمان جب تک دنیا میں حکمران رہے یعنی تقریباً بارہ سو سال تک، کسی مسلم حاکم نے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، خلافت کے نام پر برسر اقتدار آیا ہو یا کسی اور نام سے، کسی حکمران نے اسلامی قانون (یعنی قرآن وسنت اور ان کی روشنی میں کیے گیے اجتہادات) کی بالادستی کو چیلنج نہیں کیا اور کسی بھی مسلمان ملک میں، کسی بھی عہد میں اسلامی قانون کے علاوہ کسی اور نظام قانون کے تحت فیصلے نہیں ہوئے۔ تاہم پہلی جنگ عظیم کے بعد استعمار نے جب مسلمانوں کو غلام بنالیا، ان کے ممالک پر قبضہ کرلیا تو اس نے ایک پلاننگ کے تحت ان مسلمان ممالک کے اجتماعی ڈھانچے کو اسلام سے ہٹا کر مغربی فکر وتہذیب پر استوار کیا اور انہیں مستقل فکری وعملی غلام بنانے پر ساری کوششیں مرکوز کردیں۔ استعمار کو اس میں کامیابی ملی۔ مزید اس نے یہ کیا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اسے مسلم ممالک کو بظاہر سیاسی آزادی دینا پڑی تو اس نے صرف چولا بدلا اور پر امن انداز میں استعماری ذہنیت اور مقاصد کے حصول کے لیے اس نے ہر مسلمان ملک کو فکری وعملی غلام رکھنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا قائم کردہ قانونی وعدالتی نظام بلکہ سارا اجتماعی ڈھانچہ مشتمل بر سیاسی نظام، معاشرتی نظام، تعلیمی نظام وغیرہ ابھی تک وہی چلا آرہا ہے جو استعمار نے قائم کیا تھا اور ہر مسلمان ملک میں حکمران بلکہ حکمران طبقات وہی ہیں جو استعمار کی مرضی کے ہیں اور سارا نظام زندگی خصوصاً مغرب کا عدالتی وقانونی نظام ہی مسلمان ملکوں میں رائج ہے، سوائے سعودی عرب اور جزوی طور پر افغانستان وایران کے۔

ii۔ بدقسمتی سے بعض بڑے علماء کرام اور مسلم مفکرین ومصلحین نے اس مغربی اجتماعی ڈھانچے کو (معمولی اور غیر موثر تبدیلیوں کے بعد) کلاً یا جزواً قبول کرکے اور اس کے اندر رہ کر کام کرنے کی حامی بھر لی۔ (جیسے مولانا مودودی مرحوم نے 'اسلامی جمہوریت' کے نام پر اور مفتی تقی عثمانی صاحب نے 'اسلامی بنکنگ' کے نام پر)۔ اس کے دو مہلک نتیجے نکلے۔ ایک یہ کہ اجتماعی

ڈھانچے کی اصل اسلامی اصولوں پر تعمیر نو کی ضرورت واہمیت ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی اوراس کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی اور دوسری طرف مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے اصول واقدار مسلم معاشرے پر غالب آ گئے ہیں جیسا کہ منطقی طور پر ہونا چاہیے تھا۔اس صورتِ حال کا شعبۂ قانون پر یہ اثر پڑا کہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں جتنے لاء کالج ہیں کسی میں شریعت کی تفصیلی تعلیم کا انتظام نہیں (سوائے کسی حد تک بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے)اور دینی مدارس میں جو فقہ واصول فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے وہ طلبہ کو اس قابل نہیں بناتی کہ وہ ملک کے قانونی وعدالتی نظام میں کوئی بڑا کردار ادا کرسکیں،سوائے کسی ایک آدھ استثناء کے،جس کا ماخذ ذاتی کاوش ہے نہ کہ دینی مدارس کا نظام تعلیم۔

۲۔مغرب کے قانونی وعدالتی نظام کی پاکستان میں تنفیذ اورقرآن وسنت پر بالادستی

i۔ انگریزی قانون کا تسلسل

مذکورہ صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ہندوستان میں انگریز نے جو قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا تھا وہی پاکستان میں آج بھی نافذ ہے۔یادرہے کہ مسلم ہندوستان میں اسلامی روایات کے مطابق قاضی عدالت میں نہ مدوّن قانون ہوتا تھا،نہ موجودہ طرز کے وکیل اور جج (جو نہ دین کے عالم ہوتے ہیں اور نہ ان کا حلیہ اور لباس اسلامی ہوتا ہے)۔اس وقت قاضی دین کا عالم ہوتا تھا اور فیصلہ فوراً ہو جاتا تھا۔ضرورت ہوتی تو وہ مفتی صاحب سے مشورہ کرلیتا۔یہ مفتی صاحبان بعض اوقات نظام عدالت کا حصہ ہوتے تھے اور نہ بھی ہوں تو مسلم معاشرے میں فقہاء وعلماء ہمیشہ موجود ہوتے ہیں جن سے قاضی صاحب مشورہ کر لیتے تھے۔

ii۔ انگریزی قانون اصلاً غیر اسلامی ہے

قانون کی فکری بنیاد کیا ہے؟ یہ کہ اچھا کیا ہے برا کیا ہے؟ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ صحیح کیا ہے،اور غلط کیا ہے یا صحیح کی خلاف ورزی کرنے اور غلط پر عمل کی سزا کیا ہوگی؟ اگر ان باتوں کا فیصلہ خدا کرے تو قانون مذہبی ہوگا،اسلامی ہوگا اور اگر انسان خود اپنی عقل اور تجربے سے یہ فیصلہ کرے تو یہ قانون انسان کا وضع کردہ ہوگا،غیر مذہبی اور غیر اسلامی ہوگا۔ہم یہاں وحی اور عقل کے تقابلی مطالعے کی کسی تفصیل میں نہیں جاسکتے لیکن اتنی بات واضح ہے کہ ہم

مسلمانوں کے نزدیک معیار وحی ہے، عقل نہیں۔ اگر چہ ضروری نہیں کہ عقل کی ہر بات خلاف اسلام ہی ہو۔

موجودہ مغربی فکر وتہذیب مسیحیت کو ٹھکرا کر وجود میں آئی ہے اور انسانوں کی وضع کردہ ہے بلکہ یہ مذہب مخالف ہے۔ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپیریسزم کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ مذہب مخالف اور اسلام مخالف ہے۔ یہ توحید، رسالت اور آخرت کی نفی کرتی ہے۔ وحی کے مقابلے میں عقل وتجربہ کی بالادستی کی قائل ہے۔[1] لہٰذا بحیثیت مسلمان ہم حق بجانب ہیں اگر ہم یہ اصولی مطالبہ کریں کہ پاکستان کا قانونی وعدالتی نظام اسلامی ہونا چاہیے نہ کہ مغربی اور انگریزی قانون وروایات پر مبنی۔ اسلامی قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنے اور اسے نافذ کرنے کے بعد دیکھا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی انگریزی قانون خلاف اسلام نہ ہو تو اسے بھی قبول کرلیا جائے۔

یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ مغربی قوانین میں سے برٹش کامن لاء میں انسان کا وضع کردہ ہونے کے علاوہ دو مزید بنیادی خرابیاں ہیں: ایک یہ کہ وہ کیس لاء (Case Law) ہے اور دوسرے یہ کہ وہ پروسیجرل لاء ہے۔ ان دو کمزوریوں کی وجہ سے اس سے انصاف جلدی نہیں ہوسکتا اور یہ چیز بھی اسلامی نظام قانون کی بنیادی سپرٹ کے خلاف ہے۔

iii۔ انگریزی قانون کی قرآن وسنت پر بالادستی

بات یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے سارے شعبے آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کا تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہو اور صرف عدالتی وقانون نظام کو اسلامی بنانے کی کوشش کی جائے۔ سیاسی نظام اگر نیشن سٹیٹ پر مبنی ہو، مغربی جمہوریت پر مبنی ہو، ریاست میں آئین کی بالادستی (Constitutionalism) پر مبنی ہو اور آئین پارلیمنٹ کی بالادستی (وہ جو قانون چاہے بنائے، خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی) اور مغرب کے دیئے گئے انسان حقوق کی بالادستی کی ضمانت دیتا ہو تو آئین سازی اور قانون سازی اسلام کے مطابق کیسے ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں میں یہ بات متفقہ، مسلّمہ اور غیر اختلافی ہے کہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی،

---

[1] ہم نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ اس بات کو نقلی وعقلی دلائل سے ثابت کیا ہے، دیکھیے اس موضوع پر ہماری حالیہ کتاب ُاسلام اور ردمغرب ُ۔

مسلمانوں کا دستور قرآن وسنت ہے اور ہر وہ قانون، روایت اور عرف نا قابل قبول ہے جو خلافِ قرآن وسنت ہو۔ لہٰذا اگر انتظامی ضرورت کے لیے ریاست کا دستور بنانا ہی ہو تو اس کی پہلی دفعہ یہ ہونی چاہیے کہ اس ریاست کا دستور اساسی قرآن وسنت ہے اور ریاست کے کسی بھی ادارے کا ہر وہ فیصلہ قانون، قاعدہ قابل رد ہوگا جو خلافِ قرآن وسنت ہو اور اسے اس بنیاد پر ایسی اعلیٰ عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا جس کے ججز قرآن وسنت کے ماہر ہوں۔ مگر بدقسمتی سے پاکستانی آئین میں یہ دفعہ شامل نہیں کی گئی۔ اس سے ملتی جلتی بات قرار داد مقاصد میں کہی گئی تھی لیکن اسے بطور مقدمہ رکھا گیا اور دستور کے قابل نفاذ حصے میں شامل نہ کیا گیا۔ پھر جنرل ضیاء الحق نے اسے آئین کا حصہ بنایا لیکن سپریم کورٹ نے پھر بھی اسے سارے آئین پر حاوی ماننے سے انکار کر دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پاکستان میں اور پاکستانی آئین میں قرآن وسنت اور آئین میں اختلاف ہو تو ججز فیصلہ آئین کے مطابق کرتے ہیں قرآن وسنت کے مطابق نہیں۔ یہ اتنی بڑی بات ہے کہ آسمان ہمارے سر پر گر پڑے تو کم ہو کیونکہ اس کے لیے قرآن نے ظالم، فاسق اور کافر کے الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن یہ سر عام ہو رہا ہے اور اس کی ایک مثال ممتاز قادری شہیدؒ کا کیس ہے جس میں ابتدائی عدالت کے جج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ ملزم نے شرعاً کوئی جرم نہیں کیا لیکن پاکستان میں دہشت گردی کے قانون کے تحت میں اسے دو دفعہ سزائے موت دیتا ہوں اور جب کیس اپیل میں سپریم کورٹ میں پہنچا اور شہیدؒ کے وکیل نے قرآن وسنت سے دلائل دینا شروع کیے تو سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے کہا کہ ہم شریعہ کے ماہر ججز نہیں ہیں۔ اگر آپ نے شریعت پر فیصلہ لینا تھا تو وفاقی شرعی عدالت جاتے ہم تو آئین کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ دوسرے دن انہوں نے اپیل خارج کر دی۔ یہاں سوال یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے جج شریعت کے ماہر کیوں نہیں ہیں؟ اور جو شریعت کے ماہر نہیں ہیں وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عدالت عظمیٰ کے جج کیسے بن گئے ہیں؟ کیا اس کا مطلب اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے کہ خود ریاست نے عملاً یہ انتظام کیا ہے کہ اس کا سارا عدالتی نظام قرآن وسنت کی بجائے آئین کے مطابق ہوگا اور صرف وفاقی شرعی عدالت کا نظام قرآن وسنت پر مبنی ہوگا۔ کیا یہ وہی ظلم، فسق اور کفر نہیں ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور اس کفر کی موجودگی میں پاکستان کو ایک اسلامی مملکت کیسے کہا جا سکے گا؟

iv۔ تقنین (Codification) کا مسئلہ

مغربی قانون کا ایک اہم جز و مرتب قانون ہے۔ اسلامی نظام قانون (یعنی قرآن وسنت اور مجتہدین کے اجتہادات کا مجموعہ) دفعہ وار مرتب قانون نہیں تھا۔ چنانچہ استعمار نے جب مسلم ممالک پر قبضہ کیا تو اس نے شرعی عدالتیں ختم کر کے اسلامی قانون کی تقنین یعنی Codification شروع کر دی۔ اب ظاہر ہے تقنین کا یہ عمل اسلام کے نظام قانون کے انتہائی وسیع ذخیرے کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تقنین کا یہ عمل آج بھی جاری ہے اور آئندہ بھی حسب ضرورت جاری رہے گا۔ اور تقنین کا کام کرنے والے لوگ کون ہیں؟ وہ لوگ جو مقننہ (قانون ساز اسمبلی) کے ممبر ہیں اور جن کی بہت بڑی اکثریت نہ اسلامی قانون سے واقفیت رکھتی ہے نہ مغربی قانون سے۔ وہ محض سیاستدان ہوتے ہیں یعنی سرمایہ دار اور جاگیردار جو سیاست اور انتخابات کے ذریعے یا فوج کے ذریعے اقتدار میں آ کر حکومت کرتے ہیں۔ قانون بنانے والے اصلاً وہ وکیل اور جج ہوتے ہیں جنہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ مغربی قانون پر عمل کرتے گزارا ہوتا ہے اور ان کا لائف سٹائل مغرب زدہ ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی نہ دین کا عالم ہوتا ہے اور نہ اسلامی زندگی گزارنے والا شخص۔ لہٰذا ان کی بہت بڑی اکثریت شرعی تعلیمات کی جب کوڈی فیکیشن کرتی ہے تو یا تو انجانے میں غلطیاں کرتی ہے یا مغربی تصورات اور مغربی قوانین کو اسلامی قوانین میں سموتی ہے یا پھر اقوام متحدہ کے غیر اسلامی قوانین کی پیروی کرتی ہے یا امریکہ و یورپی یونین وغیرہ کے دباؤ پر پاکستانی حکومتیں قانون سازی کرتی ہیں جیسے حال ہی میں فیٹف کے دباؤ پر اوقاف کے اور دیگر قوانین بنائے گئے۔

برصغیر میں تقنین کب شروع ہوئی؟ جب مسلم اقتدار ختم ہوا اور انگریز نے ملک پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے اسلامی نظام عدالت اور علماء قاضیوں سے جان چھڑانے کے لیے پہلے سول کورٹس بنائیں جن کے جج انگریز تھے۔ اب انگریز کیا جانیں کہ شریعت کا قانون کیا ہے؟ لہٰذا ایک مستشرق ہملٹن نے ہدایہ کے کچھ حصے کا انگریزی ترجمہ کیا اور بتدریج تقنین کا عمل شروع ہوا اور قوانین انگریزی میں مدون ہونے لگے۔

تقنین کے بعد علماء اور قاضیوں کی ضرورت نہ رہی۔ اب کوئی شخص جو مسلمان نہ ہو، یا

مسلمان ہو لیکن دین کا عالم نہ ہو، قرآن وسنت کے علوم میں مہارت نہ رکھتا ہو، جس نے فقہ واصول فقہ کا مطالعہ نہ کیا ہو اب وہ بھی جج بن سکتا ہے۔ اب مفتیوں کی بھی ضرورت نہ رہی اور ایسے وکیل سامنے آنے لگے جو ان مدون شدہ یعنی Codified قوانین کے ماہر تھے۔

خلاصہ یہ کہ تقنین اسلام کے نظام قانون اور نظام عدالت سے ایک مذاق کے مترادف ہے کہ ایک شخص جو قرآن وسنت اور فقہ کا عالم نہیں وہ جج اور قاضی بن بیٹھتا ہے اور فیصلے کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے جج کے فیصلوں کے بارے میں کیسے اطمینان ہو سکتا ہے کہ وہ مطابق قرآن وسنت ہوں گے؟

حاصل بحث

نہ صرف اسلام آباد ہائیکورٹ کے فاضل جج صاحب جسٹس بابر ستار صاحب کا مذکورہ فیصلہ غیر اسلامی ہے بلکہ ہمارا پورا نظام قانون اور نظام عدالت غیر اسلامی ہے کیونکہ عدالت اس امر کی پابند نہیں کہ وہ اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرے اور نہ ہمارے فاضل جج صاحبان قرآن وسنت اور فقہ میں مہارت رکھتے ہیں لہٰذا وہ اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ نہ اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان اجتہاد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان حالات میں ہماری عدالتوں میں اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم علماء کرام، دینی جماعتوں کے قائدین، اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان، اصحاب سیاست، اسٹیبلشمنٹ اور حکمران طبقوں کے نمائندین، ملک کے دانشوروں، صحافیوں اور ادیبوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلے پر غور فرمائیں اور ہماری اور قوم کی رہنمائی فرمائیں کہ ہم مسلمان اپنی ریاست میں نظام قانون اور نظام عدالت کو اسلامی تقاضوں سے کیسے ہم آہنگ کریں اور اس کے لیے کیا اقدامات کریں؟

خصوصاً ہماری مقننہ اسلام کے متفقہ عائلی قوانین کے خلاف جو قانون سازی کر رہی ہے اور ہماری عدالتیں جو ان کے خلاف بے دھڑک غیر اسلامی فیصلے کر رہی ہیں، ان کو اس سے کیسے روکا جائے اور اسلام کے عائلی قوانین پر عمل درآمد کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں؟

اسلام اور پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

پاکستان کا سیاسی بحران۔ دروس و عبر

* عمران خان کی ناکامی کے اسباب اور اقتدار سے بے دخلی کی وجوہات
* سیکولر سیاسی جماعتوں، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کا کردار
* دینی سیاسی جماعتوں اور مولانا فضل الرحمن کا رول
* حل کیا ہے؟

ہم معروف معنوں میں نہ سیاستدان ہیں اور نہ ہمیں آئندہ کبھی عملی سیاست کرنی ہے۔ ہمارا موضوع، جس پر ہم سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں، وہ ہے اسلام اور پاکستان یعنی پاکستان کو ایک صحیح سچی اسلامی ریاست بننا چاہیے۔ اس کا طریق کار کیا ہو؟ کون سا طریقہ غلط ہے اور کون سا صحیح؟ اس میں موجودہ سیاسی جماعتوں اور اسٹیبلشمنٹ کا کیا کردار ہے؟ دینی سیاسی جماعتوں کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ یا اگر آپ دینی حلقوں میں مروج اصلاحات استعمال کریں تو پاکستان میں اسلام کیوں غالب نہیں آیا؟ شریعت کیوں نافذ نہیں ہوسکی؟ اور کیسے ہوسکتی ہے؟ وغیرہ۔

سیکولر سیاسی جماعتیں

ہم پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو سیکولر سیاسی جماعتیں کیوں کہتے ہیں؟ دیکھیے مغرب نے جو جمہوریت ایجاد کی ہے اور اپنے حربی، سیاسی، معاشی، تہذیبی، تعلیمی... تفوق اور غلبے کی وجہ سے ساری دنیا میں مروج کی ہے، اس کی اصل کیا ہے؟ اس کی اصل یہ ہے کہ وہ مغرب کے جس سیاسی نظام کا ایک حصہ ہے، وہ سیاسی نظام پیداوار ہے مغرب کے ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی اور مغرب کا ورلڈ ویو یہ ہے کہ انسان اس زمین میں خودمختار اور قادر مطلق ہے کوئی اس کا خدا نہیں اور نہ کوئی آخرت ہے۔ علم کا منبع انسانی عقل، حواس اور تجربات ہیں، وحی کوئی چیز نہیں۔ یہ ورلڈ ویو ان بنیادی نظریات سے مستنبط ہے جو مغرب میں رائج ہیں جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، میٹریل ازم اور ایمپریسزم وغیرہ۔ یہ نظریات مذہب کی نفی کرتے ہیں۔ توحید و رسالت و آخرت اور انسان کے اللہ کا عبد ہونے کی نفی کرتے ہیں بلکہ خود ان نظریات نے دین کے متبادل اور مقابل ایک مستقل نظام حیات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ گویا مغرب کی جمہوریت ہیومنزم پر مبنی

ہے اور اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ سپریم ہے کیونکہ وہ قادر مطلق فرد/عوام کی نمائندہ ہے اور آئین سپریم ہے اور ریاست کے سارے ادارے اسی کے مطابق کام کریں گے کیونکہ وہ قادر مطلق فرد/عوام نے یا ان کی نمائندہ پارلیمنٹ نے وضع کیا ہے۔ یہ جمہوریت سیکولرزم پر مبنی ہے اسی وجہ سے عدلیہ، مقننہ، انتظامیہ کے افراد پر کوئی مذہبی شرائط عائد نہیں کی جاسکتیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے پاکستان میں عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کے افراد پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ دین کے عالم ہوں، یا دین پر عمل کرتے ہوں اور نہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں سے دین پر عمل کرائیں۔ حاصل یہ کہ مغربی جمہوریت خدا کے مقابلے میں انسان کی خدائی کی علم بردار ہے۔ یہ سیکولر ہے، یہ لبرل ہے، یہ سرمایہ داری پر مبنی ہے اور یہ وحی کی بجائے عقل اور انسانی خواہشات کا اتباع کرتی ہے....

بات طویل ہو رہی ہے جبکہ یہ ہمارا اصل موضوع نہیں تھا۔ لہٰذا ایک دو مثالیں دے کر ہم اس موضوع کو سمیٹ لیں گے مثلاً آصف زرداری صاحب نے نواز شریف صاحب سے پی سی بھوربن میں قرآن پر ایک معاہدہ کیا۔ چند ہفتے بعد انہوں نے اس وعدے کو توڑ دیا۔ ایک صحافی نے اس پر ان سے سوال پوچھا تو انہوں نے کہا کہ سیاسی معاہدے قرآن کا حرف نہیں ہوتے۔ اسی طرح ممتاز قادری شہیدؒ والے کیس میں سپریم کورٹ کے ججوں نے شہید کے وکیل کو شرعی دلائل دینے سے روک دیا اور کہا کہ ہم تو شریعت کے ماہر جج نہیں ہیں۔ ہم نے تو فیصلہ آئین کے مطابق کرنا ہے اور پھر اپیل رد کر دی۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت مغرب کے لادین نظریات کی پیداوار ہے اور اس جمہوریت کے سارے شعبے اس کے مقاصد اصلیہ کے حصول کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ مغربی ممالک میں جمہوریت پر عمل درآمد میں مذہب کا کوئی کردار نہیں۔ ہمارے ہاں جو جمہوریت نافذ ہے وہ بنیادی طور پر مغربی جمہوریت ہی ہے۔ کاغذوں میں چند اسلامی اصول لکھ دینے سے اور دل کو خوش رکھنے کے لیے یا محض قانونی شرط پوری کرنے کے لیے اور اسے 'اسلامی جمہوریت' کہنے سے وہ اسلامی نہیں جاتی، بلکہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس جمہوریت کے نفاذ سے پاکستان میں اسلام تو غالب نہیں آیا، شریعت تو نافذ نہیں ہوئی الٹا مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار جیسے سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریل ازم وغیرہ غالب آ گئے ہیں اور ہماری اس بات کو کوئی غلط نہیں ٹھہرا سکتا سوائے اس کے جس کی آنکھوں پر مغرب کی پٹی بندھی ہو۔

تو جو جمہوریت ہمارے ہاں نافذ ہے اس میں سیاسی جماعتیں کسی دینی مقصد کے لیے بنائی ہی نہیں جاتیں۔ وہ تو حصول اقتدار کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ ان کا بنیادی فلسفہ ہے انتقالِ اقتدار، یعنی وقتاً فوقتاً انتخابات کرائے جائیں اور جس پارٹی کو عوام (جو خود مختار ہیں، قادر مطلق ہیں، طاقت کا منبع ہیں، اختیار کے مالک ہیں) پسند کریں وہ حکومت بنائے اور ملک چلائے۔ اب عوام الناس چونکہ مسلمان ہیں اور سیاسی جماعتوں نے ان سے ووٹ لے کر حکومت بنانی ہے لہٰذا ہر سیاسی جماعت اپنے منشور میں کچھ اسلامی وعدے، کچھ اسلامی نعرے شامل کر لیتی ہے جن پر عمل بالعموم مطلوب نہیں ہوتا بس اسلام پسند عوام اور دینی لوگوں کو بہلانا، پھسلانا اور مطمئن کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے عوامی دباؤ سے اگر کچھ اسلامی قوانین بنا بھی لیے جائیں تو ان پر کوئی عمل نہیں کرتا مثلاً ۱۹۷۹ء سے حدود قوانین پاکستان کے آئین میں شامل ہیں لیکن ان پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ آج تک ایک حد نافذ نہیں ہوئی۔ ارکان اسمبلی کے لیے اسلامی شرائط رکھی گئیں ہیں لیکن ان پر آج تک کسی نے عمل نہیں کیا۔ کوئی ریاستی ادارہ ان اسلامی قوانین پر نہ عمل کرتا ہے اور نہ عمل کا مطالبہ کرنے والوں کی بات پر کان دھرتا ہے۔

اسٹیبلشمنٹ کا کردار

بدقسمتی سے پاکستانی فوج کو شروع ہی سے اقتدار کا چسکا پڑ گیا اور فوجی سپہ سالاروں جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل مشرف نے طویل برسوں تک ملک پر حکومت کی۔ اس کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ کی حیثیت اب خاموش کنگ میکر کی ہے اور ہوتا وہی ہے جو فوج چاہتی ہے۔ صرف وہ سیاسی جماعت یا شخص برسر اقتدار آ سکتا ہے جو فوج کو نیک چلنی یعنی اس کے ساتھ فدویانہ تعلق، وفاداری بلکہ تابعداری کا یقین دلائے اور ذرا بھی جس سر میں ذرا غرور آئے اور وہ من مانی کرے اسے اقتدار سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ جونیجو، نواز شریف اور عمران نیازی کا حشر اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

اور اس سے بھی آگے مزید پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہماری فوج برٹش انڈیا میں انگریز استعمار کی تربیت دی گئی فوج ہی کی توسیع ہے جس کے نتیجے میں نہ وہ پرو اسلام ہے اور نہ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی مخالف، بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے اور ہماری سیاسی حکومتوں کی طرح ہماری فوجی حکومتیں بھی پرو مغرب رہی ہیں اور آج بھی فوج میں وہی مائنڈ سیٹ

ہے۔اسلام ان کے نزدیک اتنا ہی ہے کہ ہر چھاؤنی میں مسجد ہوتی ہے جس میں نچلے گریڈ کا ایک مولوی صاحب ان کو نماز پڑھا دیتا ہے۔اللہ اللہ خیر صلاّ۔

بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کا کردار

جیسا کہ ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے کہ نہ صرف مغرب کی الحادی فکر وتہذیب اسلام مخالف ہے بلکہ اس کے علم بردار ممالک اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔انہوں نے اسلامی جماعتوں کو مسلم ممالک میں برسر اقتدار نہ آنے دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔مسلمان ممالک کے اکثر حکمران،خواہ وہ سول ہوں یا فوجی،ان کی آشیر باد سے ہی برسر اقتدار آتے ہیں اور ان کی رضامندی سے ہی برسر اقتدار رہ سکتے ہیں۔

مسلم ممالک میں امریکی (اور کسی حد تک یورپی یونین کے) سفیر کی حیثیت وائسرائے سے کم نہیں ہوتی اور امریکی سی آئی اے ہماری حکومتوں،ان کی پالیسیوں اور ہماری خفیہ ایجنسیوں کو براہ راست یا بالواسطہ موثر طریقے سے کنٹرول کرتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف ہماری حکومتیں اور ہماری اسٹیبلشمنٹ (اور اسٹیبلشمنٹ میں فوج کے علاوہ دیگر حکمران طبقوں جیسے سول بیوروکریسی اور عدلیہ وغیرہ کو بھی شامل سمجھیے) امریکی اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر کام کرتی ہے بلکہ ایسی سیاسی جماعتیں،صحافی،علماء اور ادیب بھی موجود ہیں جو بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ان کی اسلام اور پاکستان سے وفاداری،ظاہر ہے،مشکوک ہے لیکن ان کے منہ کون آئے؟اور ان کو کون روکے؟جبکہ روکنے کی طاقت رکھنے والوں کی اپنی اسلام اور نظریۂ پاکستان سے کمٹمنٹ سوالیہ نشان ہے۔

عمران خان کی ناکامی کے اسباب

اس تمہیدی تجزیے کی روشنی میں اب عمران خان کی ناکامی آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔عمران خان کے سیاست میں آنے سے پہلے حالات یہ تھے کہ دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہو چکی تھیں (اور ناکام بنا دی گئی تھیں جس کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں) اور مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی باری باری حکمرانی کر رہی تھیں اور ان کی حکومتوں کے خاتمے کی ایک بڑی وجہ اسٹیبلشمنٹ کا اعتماد کھونا بھی ہوتا تھا۔اسلام کے لیے کام کرنا تو ان کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں تھا

،وہ پاکستان کے مفادات اور پاکستانیوں کی مشکلات ومسائل کے حل کے لیے بھی ٹھوس کام نہ کر پارہی تھیں۔کرپشن اور گورننس کے مسائل بھی اپنی جگہ تھے۔

ان حالات میں عمران خان میدانِ سیاست میں اس دعویٰ کے ساتھ داخل ہوئے کہ وہ کرپشن، معیشت اور گورننس کے مسائل حل کر کے تبدیلی لائیں گے اور نیا پاکستان بنائیں گے۔انہوں نے طویل برسوں محنت کی، ناکامیوں سے مایوس نہ ہوئے ،انہیں کچھ عوامی تائید بھی ملی اور اسٹیبلشمنٹ نے بھی انہیں موقع دینے کا فیصلہ کرلیا چنانچہ وہ حکومت میں آ گئے لیکن اسٹیبلشمنٹ بھی اب سمجھ دار ہوچکی اور تجربات سے بہت کچھ سیکھ چکی۔چنانچہ اب وہ کسی سیاسی جماعت کو سارے صوبوں اور مرکز میں بڑی اکثریت لینے نہیں دیتی تاکہ لگام ان کے ہاتھ میں رہے۔چنانچہ عمران خان سب سے زیادہ نشستیں لینے کے باوجود صرف اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے چھوٹی پارٹیوں کو ساتھ ملا کر ہی حکومت بنا سکے۔

ساڑھے تین سال گزر گئے لیکن عمران خان مسائل حل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ معاشی حالت مزید بگڑ گئی اور عوام مہنگائی سے بلبلا اٹھے، کرپٹ لوگوں سے نہ پیسہ وصول ہوا نہ انہیں سزائیں دلائی جاسکیں۔نہ حکومتی اداروں کی مؤثر اصلاح ہوسکی اور نہ گڈ گورننس کے اچھے نتائج سامنے آسکے۔ہمارے نزدیک ان کی اس ناکامی کی دو بڑی وجوہات تھیں :ایک یہ کہ ان کے پاس یکسو اور اہل افراد کی ٹیم تھی نہ وہ اسے ڈویلپ کرپائے۔دوسرے یہ کہ ان میں آؤٹ آف باکس فیصلے کرنے کی فراست اور جرأت سامنے نہ آسکی۔صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کا موجودہ اجتماعی نظام کا ڈھانچہ (معاشی، تعلیمی ،عدالتی ،سیاسی ....نظام) دوا نہیں داء (بیماری) ہے۔ہم صرف ایک مثال دیتے ہیں کہ ہم نے ملک کے معروف ماہر معاشیات ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی تجویز کہ پاکستان پلاننگ کے ساتھ ڈیفالٹ کرے تاکہ قرضوں کی فوری ادائیگی سے اس کی جان چھوٹ جائے اور عوامی خوش حالی کے لیے کام کیا جاسکے، البرہان میں کئی دفعہ شائع کی اور اس کے حق میں مضامین لکھے لیکن سننے والا کوئی نہ تھا۔پھر عمران خان کی ہٹ دھرمی اور انانیت نے اصلاح کا کوئی راستہ نہ چھوڑا کیونکہ ہر حکمران کی طرح ان کی گردن میں بھی سریا آ گیا،عوام سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا اور وہ صرف خوشامدیوں تک محدود ہو گئے۔ہم اپنی ایک چھوٹی سی مثال دیتے ہیں کہ اصلاحِ تعلیم ہمارا خصوصی شعبہ ہے اور جب سیکولر اور لبرل وزیر تعلیم شفقت

محمود صاحب نظام تعلیم اور نصاب کا بیڑا غرق کر رہے تھے تو ہم نے ایم این ایز، وزراء یہاں تک کہ صدر مملکت تک سے رابطے کیے تا کہ کسی طرح صحیح صورت حال عمران خان تک پہنچ سکے لیکن ہمیں کامیابی نہ ملی۔ اسی طرح عدلیہ اور انتظامیہ کے نظام تعلیم و تربیت اور نظام کار میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر ان سے کام لیا ہی نہیں جا سکتا اور نہ معاشرے میں کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

یہ عمران خان کی ناکامی کی حقیقی وجوہات تھیں لیکن ان کی حکومت کی چھٹی ان اسباب کی بناء پر نہیں ہوئی، ان کو اقتدار سے نکال دیا گیا یا انہیں نکلنا پڑا تو اس کے دو بنیادی سبب تھے: ایک یہ کہ وہ اپنے منبع اقتدار یعنی اسٹیبلشمنٹ کو خوش نہ رکھ سکے اور وہ ان کی حمایت سے دست بردار ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کو بھی ناراض کر لیا۔ جیسا کہ ہم سطور بالا میں عرض کر چکے کہ پاکستان میں فوج سے ناخوش افراد (سیاستدان، صحافی، علماء، ادیب وغیرہ) بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کی پناہ میں چلے جاتے ہیں تا کہ وہ زندہ رہ سکیں اور اپنے مفاد کے لیے کام کر سکیں۔ چنانچہ عمران خان اور اسٹیبلشمنٹ کے خلاف اس مہم کی سربراہی مولانا فضل الرحمن کی فراست اور دلیری کی وجہ سے ان کے حصے میں آئی۔ وہ مسلسل اس میدان میں ڈٹے رہے یہاں تک کہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی جو اپنے احتساب سے تنگ آئی ہوئی تھیں اور اپنے خلاف کرپشن کے کیسوں سے نجات چاہتی تھیں، ان سے آملیں۔ پھر آہستہ آہستہ دیگر عناصر (سیاستدان، صحافی، عدلیہ وغیرہ) اس مہم میں شامل ہو گئے اور انہوں نے عمران خان کو نکال باہر کیا۔ عمران خان اور ان کے حمایتیوں کو زیادہ مایوسی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے رویے سے ہوئی لیکن اسٹیبلشمنٹ پچ کے دونوں طرف کھیلنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سب کچھ کر جانے کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ اس نے اپنے مخالف سیاسی عناصر کے ساتھ سمجھوتے کو بھی قبول کر لیا اور عمران خان کو نکال باہر کیا۔ اور اس کا امکان بھی خاصا ہے کہ اپوزیشن کی طرح وہ خود بھی بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے دباؤ میں آ گئی ہو جیسا کہ پہلے بھی وہ اس طرح کے دباؤ میں آتی رہی ہے جیسے کہ افغانستان کے معاملے میں۔

حل کیا ہے؟

ہمارے نزدیک مسئلے دو ہیں: ایک پاکستان کا سیاسی استحکام اور دوسرے اسلام اور نظریۂ

پاکستان کے ساتھ کمٹمنٹ۔

اسلام کی بات کو پہلے لیجیے۔ہم دوسروں سے گلہ کیا کریں۔اگر اس ملک کے اجتماعی نظام میں اسلام نہیں آیا تو سیکولر سیاسی جماعتوں، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اس کے بڑے ذمہ دار خود ہمارے علماء اور دینی سیاسی جماعتیں بھی ہیں۔ جب یہ اسلام کے لیے متحد ہونے کو تیار نہیں۔اپنا مسلک اور اپنا فرقہ انہیں اسلام سے زیادہ عزیز ہے اور اسلام کے لیے افرادسازی اور ہوم ورک کرنا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تو شکست کے ذمہ دار وہ خود ہیں اور شکست وہ کھا چکے۔ان کا سیاسی وزن اور ان کی سیاسی اہمیت ختم ہو چکی (مولانا فضل الرحمن صاحب کی تھوڑی بہت قوت ایک استثنائی معاملہ ہے جس کی وجہ اسلامی عصبیت نہیں بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں جن کی تفصیل میں جانا بے سود ہے)اس شکست کے اسباب کو سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے جب علماء اور دینی قوتیں خود تیار نہیں تو کوئی دوسرا ان کی مدد کیسے کر سکتا ہے؟ ہم البرہان کے صفحات سیاہ کرتے رہتے ہیں بلکہ اس موضوع پر پوری کتاب (پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں؟۔۔۔ایک فکری تجزیہ) لکھ چکے ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟

جہاں تک پاکستان کے سیاسی استحکام کا تعلق ہے تو ظاہر ہے موجودہ سیاسی اور انتخابی ڈھانچے کو بدلے بغیر یہ ممکن نہیں۔ موجودہ سیکولر سیاسی جماعتوں سے جان چھڑانا اور ریاستی ڈھانچے میں اصلاحات لانا ناگزیر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے؟ ہمیں پاکستان میں کوئی ایسا فرد، گروہ، جماعت اور ادارہ نظر نہیں آتا جو یہ کام کر سکے اور وہ اس کے نفاذ کی قوت بھی رکھتا ہو۔

ہمیں یہ پسند نہیں لیکن زمینی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور کوئی اور راستہ کھلا نہ پا کر ہمیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ ہم بادشاہ گروں یعنی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ سے درخواست کریں کہ وہ اس پر سوچے۔ہم اپنی تجویز اختصار کے ساتھ دو دفعہ البرہان میں ان کے ملاحظے کے لیے پیش کر چکے لیکن ہماری نحیف آواز کون سنتا ہے اور وہ ان تک کیسے پہنچے؟ اور اگر پہنچے تو وہ اسے وزن کیوں دیں؟ ہم کہتے ہیں یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے؟

ہماری تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ سیاسی نظام میں ان ۹۰ فی صد عوام کی

نمائندگی کی کوئی صورت نہیں ہے جو اسلام پسند ہیں اور معاشی طور پر پسماندہ ہیں۔ سرمایہ دار اور جاگیردار سیاستدان اور الیکٹیبلز، بیماری ہیں جن سے جان چھڑانا ضروری ہے۔ ان ۹۰ فی صد عوام کی نمائندگی کے لیے نظام وضع کیجیے۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو سٹڈیز جیسے کسی ادارے میں قومی ڈائیلاگ کا انتظام کیا جائے۔ یا موزوں افراد پر مشتمل ایک کمشن بنا دیا جائے جو قومی سطح پر اس طرح کے ڈائیلاگ کا انتظام کرے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کے لگے بندھے نظام سے ہٹ کر آؤٹ آف باکس سوچا جائے اور مقامی ضروریات ومسائل کے مقامی حل کو (Indigenous Perspective) میں زیر غور لایا جائے۔ ہمارے ذہن میں بھی کچھ تجاویز ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ایک قومی ڈائیلاگ ہو جس میں ساری قوم کے ذہین عناصر اور صاحب فکر افراد حصہ لیں اور بحث ومباحثہ کے بعد ٹھوس تجاویز سامنے آئیں اور اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے ان کے نفاذ کا طریق کار بھی وضع کیا جائے۔ ھذا من عندنا والعلم عند اللہ۔

بقیہ: افغان حکومت اور Plant for Peace

اس منصوبہ پر عمل درآمد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری حکومت ایک بڑی رسدی انتظامیہ تشکیل دے جو ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہو اور جس میں ہر سطح پر طالبان اور مخلصین دین کو انتظامی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پالیسی کی تنفیذ کا اثر جو عوام کی اخلاقیات اور روحانیت پر پڑتا ہے ہر سطح پر مستقل جانچا جاتا ہے۔ ہمیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہونا چاہیے کہ معاش معاد کمانے کا ذریعہ ہے اور معاشی پالیسی اخلاقی اور روحانی تربیت کا ایک حصہ ہے۔

طالبان کا انقلاب ایک اسلامی انقلاب ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام میں ضم ہونے کے لیے برپا نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ہمیں لازماً خود کفالت کی پالیسی اختیار کرنا ہوگی۔ عالمی معیشت جو کہ سرمایہ دارانہ خطوط پر منظم ہے اس سے افغان نجی شعبہ کو محفوظ رکھنا ہوگا اور بین الاقوامی تجارت اور سرمایہ کاری کے شعبہ میں صرف افغان حکومت کی بالادستی قائم کرنا ہوگی۔ گلوبل سپلائی چین سے صرف افغان حکومت معاملات طے کرے گی کسی بیرونی نجی ادارے کو یہ کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ طالبان کی حکومت کو برقرار رکھنے اور انقلاب کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

 محمد عاصم حفیظ

یوتھ کلب پاکستان
خاموش اسلامی انقلاب۔ چند گزارشات

عالمی سطح پر اسلاموفوبیا کی لہر اور ہمارے ہاں روشن خیالی کے فروغ نے معاشرے کے ہر طبقے کو متاثر کیا ہے۔ تعلیمی اداروں میں صورت حال یہ ہے کہ اچھے خاصے دینی گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان بھی خود کو ماڈرن اور روشن خیال ثابت کرنے کی دوڑ میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ 'مولوی'، 'تنگ نظر' اور 'دہشت گرد' قرار دیئے جانے کے خوف سے لوگ نماز پڑھنے اور معمولی سی دینی شناخت سے بھی ڈرتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں کھیلوں، ہم نصابی سرگرمیوں اور تقریبات کے نام پر اب موسیقی ہے، رقص ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔ جس کے مظاہرے آپ آئے روز اخبارات میں پڑھتے اور سوشل میڈیا پر دیکھتے ہیں۔

زندگی میں کچھ ایسے تجربات بھی ہوتے ہیں جو آپ کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا جب مجھے فیصل مسجد اسلام آباد کے آڈیٹوریم میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ اگر آپ یونیورسٹی سطح کی تقریبات میں شرکت کرتے رہتے ہیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہاں کیسا ماحول ہوگا۔ ہمارے ہاں کی روشن خیالی کی بدولت المیہ یہ ہے کہ تعلیمی سرگرمیاں بھی تفریح کے انداز بلکہ آوارگی اور مغرب زدہ روایات کے مطابق سرانجام دی جاتی ہیں۔ ایسے میں اگر آپ نوجوانوں کی کسی ایسی تقریب میں شرکت کریں جس میں سیکڑوں افراد شریک ہوں لیکن وہ اسلامی طرز زندگی کا دلکش نمونہ پیش کر رہی ہو تو آپ ضرور خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جی ہاں! ایک میڈیکل کالج کے سیکڑوں طلبہ و طالبات اور دیگر تعلیمی اداروں کے شرکاء سے سجی یہ تقریب واقعی میرے لئے حیران کن تھی۔ دو روز تک جاری رہنے والی ان تقریبات کی زبان انگریزی تھی لیکن ہر تقریر اور ہر سرگرمی نوجوان نسل کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے اور قرآن و حدیث کی سچی دعوت کو پھیلانے کے لئے منعقد کی جا رہی تھی۔ ہمارے ہاں کے ایلیٹ کلاس طبقے میں اسلام کی دعوت کا یہ منظر دیکھنا واقعی ایک انمول تجربہ تھا۔ یہ میرا پہلا تعارف تھا "یوتھ کلب پاکستان" سے۔ میری حیرت اس وقت مزید بڑھ گئی جب بتایا گیا

کہ اس تنظیم کو دینی جذبہ رکھنے والی چندنوجوان لڑکیوں نے قائم کیا۔اسلام آباد کی ٹاپ کلاس یونیورسٹیز اور بہت سے فارن کوالیفائڈ نوجوانوں کی اس تنظیم سے تعارف آپ کی زندگی میں ایک خاموش انقلاب لانے کے لئے کافی ہے۔ یہ دس سال پرانی بات ہے۔ یوتھ کلب نے اس کے بعد ترقی کی کئی منازل طے کی ہیں۔انہی تقریبات کی خاص بات یوتھ کلب کا ایک سلسلہ ''ونڈز آف چینج''(Winds of Change) ہے۔ یہ نوجوان پورے ملک میں تبدیلی کی ہوائیں چلاتے ہیں۔ ہر شہر میں نوجوانوں کی تقریبات ہوتی ہیں۔سوشل میڈیا پر یوتھ کلب کی سرگرمیاں نمایاں ہیں۔

ہمارے ہاں یہ تصور عام ہے اور بہت سے سیکولر طبقے اس کی خوب تشہیر بھی کرتے ہیں کہ معاشرے کا محروم طبقہ ہی مذہب پر عمل کرتا ہے کیونکہ ان کی جدید تعلیم تک رسائی نہیں ہوتی۔ یوتھ کلب جیسی تنظیم ان سیکولرز کے منہ پر طمانچہ ہے کہ اس کا ہر رکن ملک یا بیرون ملک نامور تعلیمی اداروں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ان کا تعلق معاشرے کے وسائل رکھنے والے طبقے سے ہے۔ زندگی کی آسائشوں سے مستفید ہونا، عیاشی میں زندگی گزارنا، وسائل کو بے دریغ اڑانا، ہر قسم کی تفریح کو انجوائے کرنا ان کے لئے مشکل نہیں لیکن یہ دیوانے اس دور میں اپنے جیسے دوسرے نوجوانوں کو دین کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ان کا میدانِ عمل معاشرے کے وہ طبقات ہیں جو کسی بھی وجہ سے مساجد اور دینی طبقے سے دور ہیں۔ یہ انہیں پہلے دین کے قریب لاتے ہیں۔ انہی کی زبان میں، انہی کے انداز میں، انہی کے ماحول میں دعوت دیتے ہیں اور انہیں مساجد و مدارس کے قریب لاتے ہیں۔ یوتھ کلب کے ساتھ ان چند دنوں کی یاد یہ بھی تھی کہ یہ نوجوان ملک کے معروف دینی اداروں (جیسے جامعہ سلفیہ فیصل آباد وغیرہ) میں بھی جاتے ہیں اور وہاں کے شیوخ الحدیث سے رہنمائی اور نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ان نوجوانوں کی اکثریت اسلام آباد میں ڈاکٹر فضل الٰہی سے مستفید ہوتی ہے۔

یہ نوجوان جدید تعلیمی اداروں کے طلباء وطالبات کو تعلیمی اداروں، بڑے آڈیٹوریم، ایلیٹ کلاس کے ہوٹلز اور ہالز میں بلاتے ہیں یا خود چہروں پر مسکراہٹ سجائے حاضر ہوجاتے ہیں۔ان کی انتھک محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج یوتھ کلب پاکستان ایک پہچان بنا چکا ہے۔ یہ شمع جو چند دینی جذبہ رکھنے والے نوجوانوں نے جلائی تھی اب اس کی روشنی بہت دور تک پہنچ چکی ہے،

اب یہ قافلہ بڑی تعداد پر مشتمل ہے جس کی تقریبات اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ سیکولر طبقے کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ برطانیہ، امریکہ اور دیگر ممالک سے نامور اسلامی سکالرز کو بلایا جاتا ہے اور انہیں سننے کے لئے ہر جگہ بڑی تعداد میں نوجوان موجود ہوتے ہیں۔ یوتھ کلب کے سرپرست راجہ ضیاء الحق فارن کوالیفائڈ اور ایک بہت اچھی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ یہ لوگ "ونڈز آف چینج" یعنی 'تبدیلی کی ہوائیں' کے نام سے تقریبات منعقد کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل ملک کے انگریزی اخبارات میں یوتھ کلب اور راجہ ضیاء الحق کے بارے میں تواتر سے مضامین لکھے گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ میری دلی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی جب مَیں نے اپنے ملک کے سیکولر طبقے کے ایک اہم اور نام نہاد 'دانشور' پروفیسر ہود بھائی کا مضمون پڑھا۔ دلی خوشی اس بات کی کہ دعوت دین کے اس معرکے میں تیر واقعی نشانے پر لگے ہیں۔ ہود بھائی پروفیسر تو فزکس کے ہیں لیکن زیادہ تر اظہارِ خیال اسلام مخالف موضوعات پر ہی کرتے ہیں۔ شائد انہوں نے زیادہ غصہ اس لیے بھی کیا کہ یوتھ کلب نے کچھ عرصہ پہلے برطانیہ کے ڈاکٹر حمزہ زورٹس کے ساتھ ہود بھائی کے مذاکرے کا اہتمام کیا تھا جس میں انہیں منہ کی کھانا پڑی تھی۔ اس پر مجھے ایک مشہور قول یاد آیا کہ "سچ کی پہچان کرنی ہو تو یہ پتہ چلائیں کہ کفر کے تیر کہاں گر رہے ہیں"۔ ہود بھائی اور ان کے مافیا کی جانب سے لگاتار مضامین لکھے گئے جن میں یوتھ کلب کی سرگرمیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ یوتھ کلب والوں کو مبارک ہو کہ اللہ تعالی نے ان سے کچھ ایسا کام لیا ہے جس کی بدولت وہ اس ملک کے سیکولر، لادین اور دہریت کے علمبردار طبقے کی نظروں میں کھٹکنے لگے ہیں۔ ان کو تکلیف یہ ہے کہ کیوں نوجوان نسل اب تفریح اور آوارگی کے لئے منعقدہ تقریبات کی بجائے ایسی تقریبات میں جانا پسند کرتی ہے کہ جہاں خالص قرآن وسنت کی دعوت دی جاتی ہے۔ انہیں اسلامی طرز حیات اپنانے کا درس دیا جاتا ہے۔ انہیں تکلیف یہ بھی ہے کہ اسلام کی دعوت جسے نچلے طبقے کے مدارس اور مساجد تک محدود کر دیا گیا تھا اب اعلی طبقات تک پہنچ رہی ہے۔ ان کی دعوت کی زبان انگریزی ہے۔ سیکولر طبقے کی پریشانی یہ بھی ہے کہ اس ملک کے اعلی طبقے کو انگریزی ذریعہ تعلیم کی بدولت دین کی دعوت سے دور رکھا گیا تھا کیونکہ ایسے علمائے کرام وسکالرز موجود ہی نہیں تھے جو اس زبان میں دعوتِ دین کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ لیکن بھلا ہو یوتھ کلب والوں کا کہ انہوں نے بعض عالمی شہرت یافتہ اسلامی سکالرز اور بہت سے مقامی نوجوان داعی حضرات

متعارف کرا کے اس خلا کو پر کر دیا ہے۔ یہ کوئی عام لوگ نہیں بلکہ ڈاکٹرز، انجینئرز، سافٹ ویئر ایکسپرٹ اور دیگر شعبہ جات کے ماہرین ہیں جو معاشرے کے غیر اسلامی رویوں کو ٹھوکر مار کر دعوتِ دین کے فریضے سے منسلک ہوئے ہیں۔ ان کی تفریح بھی ایسی ہوتی ہے جس میں اسلامی احکام ومسائل سکھائے جاتے ہیں۔ وہ تعلیمی اداروں میں سنت نبوی کے فروغ کے لئے سرگرم نظر آتے ہیں۔ کسی سکالر کی تقریر کے دوران جب سیکڑوں نوجوان اونچی آواز سے "تکبیر" کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو واقعی در و دیوار ہل کر رہ جاتے ہیں۔ ہر سال لیکچر سیریز اور تقریبات کا ایک سلسلہ شروع کیا جاتا ہے جس کے تحت پاکستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں کی یونیورسٹیز، کالجز، ہالز اور دیگر جگہوں پر دعوت دین کا فریضہ سرانجام دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہر سال بیرون ملک سے نامور اسلامی سکالرز کو مدعو کیا جاتا ہے۔

یوتھ کلب کی خاصیت یہ ہے کہ ان کا میدان معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو انگریزی بولتا اور سمجھتا ہے۔ وہ اردو اور پنجابی کے دینی سکالرز کو سننا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ ان کے اسٹیٹس کے خلاف تھا۔ اب یوتھ کلب نے اس طبقے کو متاثر کیا ہے اور انہی کی پسندیدہ زبان میں کیا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ نوجوانوں کے اس گروہ نے خالص کتاب وسنت کی تعلیمات کو اپنا شعار بنایا ہے اور ہمارے معاشرے میں موجود فرسودہ رسومات، بدعات اور گمراہ کن نظریات سے نوجوان نسل کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ یوتھ کلب والے اپنی تقریبات مساجد و دینی مراکز کے ساتھ ساتھ بڑے ہوٹلز، آڈیٹوریم اور ہالز میں منعقد کرتے ہیں جس سے ایسا طبقہ جو عام طور پر دینی سرگرمیوں سے دور ہی رہتا ہے وہ بھی ان میں شرکت کر لیتا ہے۔ یوتھ کلب کی ایک خوبی کھیل، تفریح اور ہلکی پھلکی سرگرمیوں کے ذریعے دعوت دین بھی ہے۔ اس سے بہت سے نوجوانوں کو خالص دینی وعظ ونصیحت کی بجائے سیر وتفریح کے ذریعے متاثر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یوتھ کلب کے تحت نوجوان لڑکیوں کی دینی تعلیم وتربیت کا بھی بخوبی انتظام کیا جاتا ہے جو دور حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس تنظیم کے تحت روزانہ، ہفتہ وار اور ماہانہ بنیادوں پر مستقل دروس قرآن، ٹریننگ ورکشاپس اور مذاکروں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جن سے ارکان کی تربیت کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یوتھ کلب پاکستان کے سکالرز کی ایک اہم خاصیت ایسے موضوعات کا انتخاب بھی ہے جو

نوجوان نسل اورخصوصا مغرب زدہ ماڈرن طبقات کومتاثر کرتے ہیں ۔یہ ماڈرن لوگوں کوروایتی درس قرآن یا کسی عالم دین کوتقریر سننے کی دعوت دینے کی بجائے ایسے موضوعات پر لیکچرز کا اہتمام کرتے ہیں جومعاشرے کے ہرفرد کی ضرورت ہوتے ہیں ۔اس سے جدید لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں جبکہ ان معاشرتی مسائل کا حل وہاں قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

یوتھ کلب کی ایک اوراہم خوبی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال بھی ہے ۔یہ سکالرز اپنے لیکچرز پریزینٹیشن کے انداز میں پیش کرتے ہیں ۔ویڈیوز اورتصاویر کا سہارالیا جاتا ہے ۔قرآن وسنت کے حوالے خوبصورت انداز میں دیے جاتے ہیں ۔چھوٹے چھوٹے پیغامات کے لئے ویڈیو شارٹ کلپس بنائے جاتے ہیں جوجلد مقبول ہوجاتے ہیں ۔آن لائن دروس ، لائیوسٹریمنگ ، سوشل میڈیا پرتشہیر کا خوب استعمال کیا جاتا ہے ۔یوتھ کلب کے تمام ممبران اعلی تعلیم یافتہ ہیں اوروہ سوشل میڈیا کواپنی دعوت کے فروغ کے لئے انتہائی مہارت سے استعمال کرتے ہیں ۔سچی بات یہ ہے کہ دورحاضر میں جہاں اسلام مخالف پروپیگنڈے کا بازارخوب گرم ہے اورمعاشرے میں دین پرعمل کومشکل بنادیا گیا ہے وہاں یہ بات کرامت سے کم نہیں کہ یوتھ کلب کے ذریعے ایسے افرادسامنے آئے ہیں جنہوں نے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی تبلیغ واشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔

چند گزارشات

یوتھ کلب پاکستان ہو یا کوئی دوسرا شخص، جماعت یا تنظیم کوئی بھی غلطیوں اورکوتاہیوں سے مبرانہیں ہوتا ۔جب کسی تنظیم کا دائرہ وسیع ہوتا ہے تو اس میں ہرمزاج کے افراد شامل ہوجاتے ہیں ۔اس تنظیم کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسے طبقے کو جو اسلام کی بنیادی باتوں سے لاعلم ہے ، انہی کے انداز میں سمجھا کر، اپنائیت کا احساس دلا کر، سیکولرز ،لبرلزم اوراسلام مخالف پروپیگنڈا سے بچا کر دین کے قریب لے آتے ہیں ۔اب دینی علوم میں مہارت رکھنے والے علمائے کرام اور پختہ علمی مزاج رکھنے والوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مساجد کے قریب آئے ان نوجوانوں کومزید دینی علوم سکھائیں ۔ان کے جذبے ،لگن اور ذوق وشوق کومزید پروان چڑھائیں اوران کی زندگیوں کودین کے مطابق بنائیں ۔(بقیہ صفحہ نمبر:۷۵)

عالم اسلام ڈاکٹر محمد امین

اسلامی افغانستان

* مستقبل کی سب سے بڑی اور حقیقی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ڈالیے

* ہماری حکومتیں 'مجبور' ہیں اور اسلامی تحریکیں بھی منقار زیر پر ہیں۔ ہم اسلام اور غلبہء اسلام کا درد رکھنے والے افراد سے ملتمس ہیں کہ وہ اس کام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

اس وقت افغانستان عالم اسلام کی وہ واحد ریاست ہے جو اسلام کے لیے مخلص اور متحرک ہے۔ طالبان مجاہدین بیس سال کے جہاد سے کندن بن کر نکلے ہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہے اور چیلنجز کا بھی ادراک ہے۔ ایران میں بلاشبہ اسلامی انقلاب آیا تھا لیکن وہ شیعہ انقلاب نکلا۔ اس نے ہمسایہ ممالک میں قدم جمانے کی کوشش کی اور بالآخر شام اور یمن کی جڑوں میں بیٹھ گیا۔ سعودی عرب، مصر، پاکستان، ملائیشیا جیسے ممالک مغربیت کی زد میں ہیں اور امریکی استعمار ان کی اسلامی حیثیت کو ابھرنے نہیں دینا چاہتا اور یہاں ایسی لیڈرشپ بھی نہیں ابھر سکی جو اسلامی کاز کے لیے سر اٹھا کر کام کرے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو افغانستان اس وقت عالم اسلام کا واحد ملک ہے جس نے لڑ کر عالم کفر اور امریکہ و یورپ کو شکست دی ہے بلکہ دیکھا جائے تو اس نے بیس سالوں میں دو سپر پاورز کو شکست دے کر دور صحابہؓ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ یہ افغانستان مستقبل قریب میں عالم اسلام کی سب سے بڑی حقیقی اسلامی ریاست کے طور پر ابھرنے والا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج وہاں مسائل کا انبار ہے اور وسائل عنقا ہیں.... لیکن ان شاء اللہ یہ مرحلہ عارضی ہے اور جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ ملک وسائل کے لحاظ سے بھی مالا مال ہو جائے گا کیونکہ وہاں قیمتی معدنیات کی کثرت ہے اور سیاسی استحکام کے نتیجے میں وہاں ان شاء اللہ معاشی استحکام بھی آئے گا۔

لیکن آج کی صورت حال یہ ہے کہ افغانستان کے ہر شعبے میں مالیات کے علاوہ باصلاحیت اور تجربہ کار اسلامی ذہن رکھنے والے افراد کار کی شدید کمی ہے۔ اس لیے ہم ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں سے کہتے ہیں جو کسی شعبے میں مہارت رکھتے ہیں اور اسلام اور غلبہ اسلام کی

تڑپ بھی رکھتے ہیں کہ وہ افغان حکومت سے رابطہ کریں اور انہیں اپنی خدمات پیش کریں۔ یقین رکھیں کہ جو لوگ آج تنگی کے وقت دین کی نصرت کریں گے اور اس راہ میں جان و مال خرچ کریں گے وہ ان لوگوں سے بدرجہا عظیم ہوں گے جو کل بہتی گنگا میں ہاتھ رنگیں گے۔

جس طرح دفاعی جہاد کے وقت سارے مسلم ممالک سے مجاہدین افغانستان میں اکٹھے ہو گئے تھے اسی طرح آج سارے مسلم ممالک سے ان با صلاحیت اور ہنر مند لوگوں کو افغانستان پہنچنا چاہیے تا کہ وہ اس حقیقی اسلامی ریاست کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

بقیہ: یوتھ کلب پاکستان

الحمدللہ! آج دنیا بھر میں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اور آج وہی ٹیکنالوجی جو اہل اسلام کو اپنے دین سے دور کرنے کے لیے ایجاد کی گئی تھی وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بن چکی ہے۔ یوتھ کلب والوں کی دعوت دین کے لیے خدمات انتہائی قابل ستائش ہیں۔ اللہ تعالی ان صالح نوجوانوں کو مزید ہمت و استقامت سے نوازے اور ان کے خلاف ہونے والے ہر قسم کے پروپیگنڈے، غلط فہمیوں اور اعتراضات سے ان کو محفوظ رکھے۔ ان نوجوانوں کو احساس کرنا ہوگا کہ جس مشکل راستے کا انہوں نے انتخاب کیا ہے اس پر چلنے کے تقاضے کیا ہیں۔ انہیں مزید استقامت اور اپنا روشن کردار معاشرے کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ان نوجوانوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ شیوخ الحدیث، علمائے کرام اور مدارس میں علمی کام کرنے والوں سے رہنمائی، نصیحت، رابطے اور تعلیم کے سلسلے کو مزید آگے بڑھائیں۔ جہاں کہیں خطا ہو رہی ہے اسے تسلیم کریں۔ مسائل اور شرعی رہنمائی کے لیے ماہر اور پختہ علمائے کرام سے رابطہ کریں۔

ان اصولوں پر اگر انہوں نے دعوت دین کے لیے اپنی کاوشیں جاری رکھیں تو ان شاء اللہ بہت جلد اس کے بے پناہ اثرات معاشرے میں دیکھنے میں آئیں گے۔ سیکولر طبقے کی تنقید پر پریشان ہونے کی بجائے اپنا کام بڑھانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا صلہ دنیا میں کوئی نہیں دے سکتا۔ انشاء اللہ آخرت میں ہی بہتر اجر و ثواب ملے گا۔ اللہ تعالی ان نوجوانوں کی دعوت دین کے لئے کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں مزید استقامت سے نوازے، آمین۔

افغانستان

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

کیا افغان حکومت کو یورپی ادارے Plant for Peace کا زرعی منصوبہ قبول کر لینا چاہیے؟

Plant for Peace وہ سامراجی ادارہ ہے جو غاصب حکومت کے دور سے افغانستان میں فعال رہا ہے۔ اس کا سربراہ James Brett ہے جس پر جنسی جرائم کے ارتکاب کے ضمن میں بارہا الزامات لگائے گئے ہیں۔

سامراجی معاشرتی تخریب کاری

افغانستان میں عسکری شکست کے بعد سامراج معاشی اور معاشرتی تخریب کاری کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اس منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طالبان عالی شان کی معاشرتی جڑیں کمزور کی جائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سامراجی اداروں کو افغان عوام تک براہ راست رسائی حاصل ہو تاکہ ان میں سرمایہ دارانہ اقدار کو فروغ دیا جائے۔ وہ اسلامی نظام زندگی کو گاہے گاہے ترک کر کے سرمایہ دارانہ معاشرت میں ضم ہو جائیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ افغان معیشت عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں پیوست ہو کر سامراج کی باج گزار بن جائے، طالبان کی حکومت اپنی اسلامی شناخت کھو دے اور عوامی مطالبات کے دباؤ میں آ کر سامراج کی عملی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہوتی چلی جائے۔

Plant for Peace کا منصوبہ

Plant for Peace کا منصوبہ اسی سامراجی معاشرتی تخریب کاری کو عملی جامہ پہنانے کا ایک ہتھیار ہے۔

اس منصوبہ کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ افغان کاشت کاروں کو سرمایہ دارانہ معاشرت اور معیشت میں ضم کرنا Plant for Progress کا بنیادی مقصد ہے تاکہ افغانستان بتدریج ایک سرمایہ دارانہ معاشرت میں تبدیل

ہوتا چلا جائے۔

۲۔ سرمایہ دارانہ معاشرت کے عوامی پھیلاؤ کے لیے Plant for Progress افغانستان کے 348 ضلعوں میں اپنے زیرنگیں ہارٹی کلچرل کمیونٹی سنٹرز قائم کرنا چاہتا ہے۔

۳۔ ان ضلعی سینٹرز پر حکمرانی ایک ڈسٹرکٹ بورڈ کرے گا جو غیر ملکی نگرانوں پر مشتمل ہوگا۔

۴۔ ڈسٹرکٹ بورڈ وہ ذریعہ ہے جو کسانوں سے اجناس خرید کر اس کی صنعت کاری (ویلیو ایڈیشن) کو ممکن بنائے گا اور ان اشیا کو بین الاقوامی خوراک کی ملٹی نیشنلز کو فروخت کرے گا۔ وہ ملک میں بھی ایک اجناسی سٹہ بازار قائم کرنے کی راہ ہموار کرے گا۔ اس طرح کسانوں میں پائے جانے والے خود کفالت کے رجحان کو ختم کر کے کسانوں میں سرمایہ دارانہ کاروبار کو فروغ دینے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرے گی۔

۵۔ Plant for Peace افغانستان کے 34 صوبوں میں صوبائی مراکز قائم کرے گا جو اپنے علاقہ کے ضلعی مراکز کی نگرانی اور نگہداشت کرے گی۔

۶۔ یہ علاقائی مراکز تمام ضلعی مراکز کی جمع کی ہوئی پیداوار کو حاصل کریں گے۔

۷۔ ان علاقائی مراکز پر ایک پراجیکٹ مینجمنٹ یونٹ کابل میں قائم کیا جائے گا جو اس پورے پروگرام کا سربراہ ہوگا۔

۸۔ Plant for Peace ملک بھر میں بین الاقوامی ترسیلی مراکز قائم کرے گا جو صوبائی مراکز سے حاصل شدہ پیداوار کو عالمی خوراک کی ملٹی نیشنلز کو تھوک کے بھاؤ بیچنے کا انتظام کرے گی۔

۹۔ پروگرام کے مرکزی ادارے بین الاقوامی Project Management Unit ماہرین پر مشتمل ہوں گے۔

۱۰۔ یہ پروگرام ملک بھر میں اجناس کی ذخیرہ اندوزی اور مواصلت کا بھی بندوبست کرے گا۔

۱۱۔ پروگرام کے تحت وسیع پیمانہ پر ان زمینوں کو بھی زیر کاشت لانے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے جو فی الحال زیر کاشت نہیں۔ اس سب کا مہتمم ادارہ کابل میں قائم شدہ پراجیکٹ مینجمنٹ

یونٹ ہوگا۔اس ادارہ کا مقصد کسانوں کی تعلیم اور تربیت کو فروغ دینا بھی ہوگا تاکہ وہ عالمی سرمایہ دارانہ خوراکی رسدی زنجیر میں جکڑے جاسکیں۔

۱۲۔ پراجیکٹ مینجمنٹ یونٹ افغانستان کے زرعی نظام کو عالمی سرمایہ دارانہ ضوابط اور معیارات کی پابندی پر مجبور کرنے کا بھی ذمہ دار ہوگا۔

اس منصوبہ کی بھرپور حمایت عالمی سرمایہ دارانہ خوراک کی کمپنیاں یونی لیور وغیرہ، برطانوی حکومت اور اقوام متحدہ کی ایجنسیاں کررہی ہیں۔

Plant for Progress کا افغان تخریب کاری کا منصوبہ دس سالہ ہے۔اس پورے عرصہ میں وہ اس منصوبہ کے تحت 6.2 بلین خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔اس بجٹ کا تقریباً 43 فیصد کاشت کاروں پر براہ راست خرچ کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔

ہماری گزارش

ہم طالبان کی حکومت سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ Plant for Progress کے اس تخریب کاری منصوبہ کو نافذ نہ کریں۔اگر یہ منصوبہ نافذ ہوا تو سامراج کی گرفت افغان معاشرت پر مستحکم ہوگی۔افغان کسانوں اور قبائلیوں میں سرمایہ دارانہ اور لادینی رجحانات عام ہوں گے اور حکومت کی معاشرتی گرفت کمزور پڑتی چلی جائے گی۔اس منصوبہ پر عمل درآمد کے ذریعہ افغان معیشت عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ذیلی طور پر پیوست اور منسلک ہوتی چلی جائے گی اور افغانستان زرعی اور معاشی طور پر کبھی خودکفیل نہیں ہوسکے گا۔اس پیوستگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتدار بتدریج اسلامی ہاتھوں سے نکلتا چلا جائے گا اور سیکولر سرمایہ دار اور سامراج کے ایجنٹ اپنی سیاسی اور معاشرتی ساکھ مستحکم کرلیں گے۔

متبادل حکمت عملی

بے شک زرعی پیداوار بڑھانے اور قابل کاشت زرعی اراضی بڑھانے کی اشد ضرورت ہے لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم سامراجی اداروں، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور سامراجی حکومتوں کی تخریب کارانہ مداخلت کے آگے گھٹنے ٹیک دیں۔یہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے

کے مترادف ہے۔

Plant for Peace جو 6.2 بلین دس سالوں میں خرچ کرنے کی آمادگی ظاہر کر رہا ہے وہ افغان زرعی شعبہ کی مجموعی ضرورتوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ نہایت سستے داموں وہ ہمارے دیہی عوام کو خرید کر سامراجی شکنجہ میں کسنا چاہتا ہے۔

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اور چونکہ 6.2 بلین ڈالر سب کے سب سامراجی ذرائع (سامراجی حکومتوں، اقوام متحدہ کے اداروں اور ملٹی نیشنلز) سے حاصل کیے جائیں گے لہٰذا لازماً Plant for Peace ایک سامراجی آلہ کار کا کردار ادا کرے گا جیسا کہ وہ افغانستان کی غدار حکومت کے دور میں کرتا چلا آ رہا ہے۔

زرعی پیداوار بڑھانا اور دیہی عوام کو منظم کرنا طالبان عالی شان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ WGAE نے حکومت افغانستان کو ایک عریضہ بھیجا ہے جس کا عنوان ہے Developing a Planning System for Imarat-e-Islamia۔ اس دستاویز میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ زرعی پیداوار بڑھانے اور دیہی عوام کو منظم کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ ہم یہاں ان تجاویز کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ طالبان کی زرعی اور دیہی عوام کی تنظیم کا بنیادی مقصد عوام میں اسلامی اقدار اور اسلامی روحانیت کا فروغ ہے۔ ہمیں اپنے عوام کو اسی اخلاقی اور روحانی سطح پر لانے کی کوشش کرنا چاہیے جس پر پہنچ کر طالبان نے ۲۰ سال تک عدیم المثال قربانیاں دی ہیں۔

۲۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا انقلاب روحانی اور اخلاقی ہے۔ ہم عوام کے دلوں سے خودغرضی، طمع، لالچ اور حرص کے جذبات کو اکھاڑ پھینکنے کی جستجو کر رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ عوام کے قلوب جذبۂ ایثار، للّٰہیت اور تقویٰ سے بھر جائیں۔

۳۔ لہٰذا عوام کو سرمایہ دارانہ خطوط پر منظم کر کے ان کو سامراجی اداروں کی ماتحتی قبول کرنے پر آمادہ کرنا اپنے اصلی مقصد انقلاب کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔

۴۔ ہم دیہی عوام کو مقصد انقلاب کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل خطوط پر منظم کر سکتے ہیں۔

۱۔ مرکزی سطح پر حکومت ایک رسدی کمیشن قائم کرے۔

۲۔ رسدی کمیشن کی شاخیں صوبائی، ضلعی اور علاقائی سطح پر قائم ہوں۔

۳۔ علاقائی سطح پر قائم رسدی کمیشن کے اراکین قبائلی زعما، علما اور کاشت کاروں پر مشتمل ہوں۔ ان کے فرائض پیداواری نگہداشت، اوزار، کھادوں اور بیجوں کی تقسیم اور کاشت کاروں کی اخلاقی اور روحانی تربیت ہوں۔

۴۔ ہر علاقائی رسدی کمیشن اپنے علاقہ کی زرعی پیداوار کا تخمینہ لگائے اور اس کا اندازہ لگائے کہ پیداوار کا کتنا حصہ علاقائی خود کفالت کے لیے درکار ہے اور کتنا حصہ فروخت کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ ضلعی کمیشن پورے ضلع کی پیداواری سکت اور اس کی خود کفالت کی ضرورت کا اندازہ لگائیں اور اس بات کا بھی اندازہ لگائیں کہ کتنی غیر آباد اراضی کو زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔

۶۔ صوبائی کمیشن ضلعی کمیشنوں کی نگرانی کرے اور فاضل پیداوار (وہ جو صوبائی خود کفالت سے زیادہ) کی تقسیم اور خریداری کو منظم کرے۔

۷۔ مرکزی رسدی کمیشن صوبائی کمیشنوں سے فاضل پیداوار کا ایک حصہ عشر کی شکل میں حاصل کرے اور وزارت منصوبہ بندی کو مطلع کرے کہ اراضی کے رقبہ میں توسیع اور پیداوار میں کتنے وسائل کی ضرورت ہے۔

۸۔ مرکزی رسدی کمیشن وہ واحد ادارہ ہو جو اجناس کی درآمد اور برآمد کا ذمہ دار ہو۔ برآمدات سے حاصل شدہ زرمبادلہ مرکزی تمویلی بینک کے سپرد کرے۔ مرکزی بینک زرمبادلہ کو درآمد کنندگان میں تقسیم کرنے کا ذمہ دار ہو۔ برآمدات اور درآمدات کے پورے کاروبار کو قومیا لیا جائے۔

تفصیل اس اجمال کی ہماری دستاویز Developing a Planning System in Imarat-e-Islamia میں ملاحظہ فرمایئے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۶۸)

خودنوشت مدیر

میں نے زندگی سے کیا سیکھا؟ (۸)

کیسے کیسے لوگ!

پینٹ شرٹ پہنے، دمکتی پیشانی، روشن آنکھیں، کھلتا چہرہ لیے وہ نوجوان میرے سامنے بیٹھا تھا۔ عمر ہو گی کوئی چوبیس پچیس سال۔ وہ البرہان کے پچھلے سالوں کے شمارے لینے آیا تھا۔ مَیں نے کہا بیٹا: آپ نے تعلیم بڑھانے کی طرف توجہ نہیں دی؟ (پچھلی ملاقات میں وہ بتا چکا تھا کہ اس نے انٹرمیڈیٹ کیا ہے اور میڈیکل REP کے طور پر کام کر رہا ہے) کہنے لگا: سوچا تھا لیکن وہ کیا ہے کہ دل نہیں مانا، ضرورت نہیں محسوس ہوئی.... مَیں نے کہا: بھئی آپ نوجوان ہو، آپ میں آگے بڑھنے کی امنگ ہونی چاہیے، مزید تعلیم حاصل کرنی چاہیے، زندگی میں ترقی کرنا چاہیے۔۔۔ جائز طریقے استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھنا، اس کے لیے محنت کرنا کوئی خلاف شریعت تو نہیں ہے؟ کہنے لگا کہ ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ بس میرا مزاج ایسا ہی ہے۔

باتوں باتوں میں مَیں نے پوچھا آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ کہنے لگا ۳۸ ہزار۔ میں نے پوچھا: کمشن کتنا بن جاتا ہے۔ کہنے لگا تین چار ہزار ماہانہ۔ مَیں نے پوچھا ابھی اکیلے ہو؟ کہنے لگا نہیں شادی شدہ ہوں۔ مَیں حیران ہوا اور کہا اس مہنگائی میں اتنی تنخواہ میں گزارا ہو جاتا ہے؟ کہنے لگا: اللہ کا شکر ہے، ہو جاتا ہے۔

اس گفتگو کے دوران وہ مسلسل مسکراتا رہا۔ خوشی اور اطمینان اس کے بشرے سے ٹپکا پڑتا تھا۔ مَیں حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس مادہ پرستی کے دور میں، حرص وہوس کے عہد میں، جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتا ہے، زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکلنا چاہتا ہے، ایک یہ نوجوان ہے جو اپنی محدود آمدنی میں خوش ہے، مطمئن ہے، جو مل رہا ہے اس پہ قانع ہے اور اس پر اللہ کا شکر گزار ہے۔ پیسے کمانے کے ناجائز طریقے تو رہے ایک طرف، وہ جائز طریقے اختیار کرنے میں بھی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس پُرآشوب اور فتنہ پرور عہد میں بھی اللہ جی آپ کے کیسے کیسے بندے چھپے بیٹھے ہیں۔

اور مجھے میرا ایک ہمسایہ یاد آ گیا۔ محلے میں تقریباً ہر شخص کے پاس گاڑی ہے اور سب لوگ آسودہ حال ہیں۔ ان سب میں ایک وہ ہے جو پرانی موٹر سائیکل گھسیٹتا پھرتا ہے۔ اس کا گھر رنگ وروغن سے خالی ہے۔ لباس معمولی ہوتا ہے۔ وہ پولیس کے محکمے میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ بال بچے دار ہے۔ تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا لہٰذا شام میں آلات بجلی مرمت کرنے والا محلے کی چھوٹی سی دکان میں بھی چند گھنٹے کام کرتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کہ وہ رزق حلال پر کاربند ہے۔ اس کے گھر میں بھی رشوت کے پیسے کی ریل پیل ہو سکتی ہے لیکن وہ حرام کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ وہ معروف معنوں میں کوئی ''مذہبی آدمی'' نہیں ہے۔ مسجد میں باجماعت نماز کا عادی نہیں۔ چھوٹی سی داڑھی بھی اب اس نے چند سال پہلے رکھی ہے ورنہ عمر بھر ہم نے اسے بے ریش ہی دیکھا۔ گورا رنگ، صاف ستھرے کپڑے، وجیہ چہرا۔ ہمارے گھروں میں رزق کی فراوانی ہے لیکن مَیں نے کئی دفعہ اس کی بیوی کو ٹھیلے والے سے سبزی خریدتے ہوئے اسے قیمت کم کرانے کے لیے تکرار کرتے دیکھا ہے۔ اس سب کے ہوتے ہوئے مَیں بعض اوقات محسوس کرتا ہوں کہ وہ ہم سب سے افضل ہے، وہ مجاہد ہے، وہ غازی ہے اور ہم اس کے مقابلے میں بونے ہیں۔

لہو جمنے سے پہلے خوں بہا دے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے
کسی بستی میں ہو گی سچ کی حُرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

CPL No. 296 Monthly Al Burhan May 2022

تدریس القرآن پراجیکٹ کے زیر اہتمام

سہ ماہی کورسز کا اجراء
ویک اینڈ پروگرام

برائے جدید تعلیم یافتہ حضرات، پروفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز اور پروفیشنلز

بالخصوص یونیورسٹی طلبہ وطالبات اور اساتذہ

قرآن اور مغربی تہذیب

ہفتے کی شام: بعد نمازِ مغرب تا عشاء، 1.5 گھنٹہ

تدریس: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (CEO)

قرآن اور تزکیہ وتصوف

اتوار کی صبح: 10:00 تا 11:30

تدریس: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (CEO)

قرآنی عربی

اتوار کی شام: بعد نمازِ مغرب تا عشاء، 1.5 گھنٹہ

تدریس: حافظ عمران طحاوی (پی ایچ ڈی سکالر)

رجسٹریشن کے لیے واٹس ایپ نمبر
0300-4107282 پر میسج بھیجیں
کامیاب امیدواروں کو سرٹیفکیٹ دیے جائیں گے

کلاسوں کا آغاز وسط مئی ۲۰۲۲ء سے، ان شاء اللہ

زیر اہتمام: پروفیسر ایم اے رفرف (چیف آپریٹنگ آفیسر)

قرآن انسٹی ٹیوٹ

15۔ شیر شاہ بلاک، [عقب برکت مارکیٹ] کیپٹن سلمان سرور شہید روڈ،
نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور